نیرنگِ ادب کی چوتھی پیشکش

دُکھوں کا سمندر
سُکھوں کا جزیرہ

مجموعۂ کلام

شاغل ادیب

ایم۔اے

نام کتاب : دُکھوں کا سمندر
سُکھوں کا جزیرہ

مصنف : شاغل ادیب، ایم اے

اشاعت : بارِ اوّل

سنِ اشاعت : ۱۹۹۴ء (۱۴۱۵ھ)

طباعت : اعجاز پرنٹنگ پریس، چھتہ بازار، حیدرآباد

ضخامت : (۱۲۸) صفحات

قیمت : ۴۰/- روپے

تعداد : (۵۰۰)

اردو اکاڈمی آندھرا پردیش حیدرآباد کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوئی۔

تقسیم کار

۱. آندھرا پردیش اردو اکاڈمی۔ اے سی گارڈز۔ حیدرآباد - ۴
۲. الیاس بک ٹریڈرس۔ شاہ علی بنڈہ روڈ، حیدرآباد - ۲
۳. حسامی بک ڈپو۔ مچھلی کمان۔ حیدرآباد - ۲
۴. مینار بک ڈپو، گلزار حوض / چارمینار۔ حیدرآباد - ۲
۵. الکتاب، میسور کوشلس، گن فاونڈری، حیدرآباد - ۱
۶. انوارِ قمر، ۳۳۵، ساکھر پیٹھ، شولاپور - ۴۱۳۰۰۵

ناشر: نیرنگِ ادب پبلیکیشنز، ۲۴/۹/۳-۴-۱، صدیق نگر، مشیرآباد، حیدرآباد ۴۸

اِنتساب

میں اپنی اس تصنیف کو اپنی شریکِ حیات
زیب شاغل ادیب
کے نام
معنون کرتا ہوں جس نے زندگی کے سفر کے ساتھ ساتھ
میرے ادبی سفر میں بھی قدم قدم پر میرا ساتھ دیا۔

شاغل ادیبؔ ایم۔اے

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید صاحب
صدر شعبۂ اردو، ایس وی یونیورسٹی۔
ترو پتی ۔ (اے پی)

پیش گفتار

شاغل ادیب عرصۂ دراز سے شعر کہہ رہے ہیں ۔ وہ محکمۂ ریلوے میں سینیئر سیکشن آفیسر (اکونٹس) کے عہدہ پر فائز رہے اور اب وظیفۂ حسنِ خدمت پر سبکدوش کے بعد شعر و ادب کی طرف اور زیادہ مائل ہو چکے ہیں ۔ موقر ادبی جرائد میں تو وہ ابتدا سے شائع ہوتے ہیں ۔ قبل ازیں انہوں نے اپنے شعری مجموعے "ذکرِ اعظم ۔ نعتوں کا مجموعہ) اور (دربارِ کرم ـــ منقبتوں کا مجموعہ) بھی شائع کئے اور اب ایک بھرپور شعری مجموعہ کو نہایت اہتمام سے مرتب کر کے پیش کر رہے ہیں۔ " دکھوں کا سمندر، سکھوں کا جزیرہ" آزاد اور پابند منظومات، غزلیات دوہوں، سانیٹ، قطعات اور رباعیات پر مشتمل ہے ۔ شاغل ادیب کسی ادبی تحریک یا گروہ سے ایسے وابستہ نہیں رہے لیکن صحت مند مثبت اور انسان دوست شعری و ادبی میلانات ان کے یہاں ملتے ہیں ۔ ترقی پسند تحریک سے بھی ان کے یہاں ایک نوع کی ہم آہنگی پائی جاتی ہے ۔ خصوصاً ترقی پسندی کے ابتدائی دور میں، اس تحریک کے شاعروں کے یہاں رومانیت کا جو غلبہ رہا، شاغل ادیب کے کلام میں محسوس کیا جا سکتا ہے ۔ کہیں کہیں تو ان کے یہاں رومانیت کا رنگ گہرا اور از ابتداء

آنکھوں کے آگے دُکھ کا سمندر تو ہے سدا
یارب کبھی تو سُکھ کا جزیرہ دکھائی دے

شاغلؔ ادیب

تا آخر موجود ہے اور بیشتر نظموں میں غمِ جہاں کا تذکرہ کرتے ہوئے کم یا زیادہ ' بین السطور میں یا حوالہ کے طور پر "ہم نشیں" - "آجا میری زہرہ آجا" - اور "سپنوں کے خول" جیسی منظومات میں غمِ ذات اور غمِ حیات کی ان کیفیات کا اظہار ہوتا ہے۔

شاغل ادیب نے صرف اپنے جذبات اور محسوسات کی ترجمانی نہیں کی ہے۔ انہوں نے اپنی آنکھیں بھی کھلی رکھی ہیں۔ مطالعہ و مشاہدہ بھی کیا ہے۔ غور و فکر سے بھی کام لیا ہے۔ اور پھر ان سب کے حاصل کو شعری لباس پہنایا ہے۔ افراد کی بے حسی زمانے کے تغافل' اخلاقی اور روحانی قدروں کے زوال' رشتوں' ناطوں کی بے معنویت عدمِ اعتمادی' اس دور کی لایعنی کیفیات' انتشار' بحران' غیر یقینی اور ہر سمت ایک ویرانی ہی ویرانی سی' ـــــ ان سب کو شاغل ادیب نے اپنی شعری گرفت میں لینے کی سعی کی ہے۔ اور کہیں کہیں بہت اچھے انداز میں۔ "خالی مکان" اور "چادر" ایسی ہی نظمیں ہیں۔ "خالی مکان" کے یہ مصرعے

در بے صدا ہیں
ہر اک سمت چھایا ہے سناٹا گہرا
مجسم خموشی
سراپا اداسی
یہ سناٹا گہرا
یہ خالی مکاں ہے
کہ اجڑا کوئی دل

"کوئی" بھی اچھی نظم ہے جس میں انہوں نے درون کی کیفیت کو پیش کیا ہے۔ شاغل ادیب نے حمد' نعت' منقبت' سلام اور مرثیے بھی لکھے ہیں۔

علاوہ ازیں ادبی، قومی اور سیاسی شخصیتوں پر بھی ان کی کئی منظومات ہیں۔ ایسی قابلِ ذکر شخصیتوں میں جگر مرادآبادی، خورشید احمد جامی، ڈاکٹر حسینی شاہد جواہر لعل نہرو، گاندھی جی، ڈاکٹر زور، اور لال بہادر شاستری شامل ہیں۔ بعض اشعار میں انہوں نے نہایت موثر انداز میں اپنے جذبات کی عکاسی کی ہے۔ بطورِ مثال جواہر لعل نہرو کی وفات پر ان کی نظم "تیرگی کا زہر" کا یہ بند ملاحظہ ہو۔

ہے روح روح فسردہ، بدن بدن مردہ
ہر ایک ذہن پریشان ہے، چشم ہے پُرنم
اُداس اُداس ہے گنگا، اُداس ہے جمنا
اک ایک نقشِ اجنتا ہے سربسر... ماتم
گلاب آج ہے کشمیر کا بجھا ہر اک
ہے آج تاج کے رُخ پر بھی یوگی کا.... غم

قومی یکجہتی کے موضوعات پر بھی شاغل ادیب کی نظمیں اچھی ہیں "نئے سال سا عہد" نئے سال کا تحفہ بھی ہے اور قومی یکجہتی کے سلسلے میں ایک شاعر کا حصہ بھی۔

میں یہاں اصناف سے قطع نظر کرتے ہوئے شاغل ادیب کی رباعیوں کا تذکرہ کروں گا۔ اس مجموعہ میں شاغل ادیب نے کچھ ایسی زیادہ رباعیات شامل نہیں کی ہیں۔ لیکن رباعی کے جو فنی، ادبی اور معاشرتی تقاضے ہوتے ہیں ان کی تکمیل ان رباعیوں میں بڑی حد تک ہوجاتی ہے۔ ان میں فن کا احترام بھی ہے۔ درسِ اخلاق بھی اور تاثر آفرینی بھی۔ یہ دو رباعیاں قاری کی توجہ اپنی طرف منعطف کرلیں گی۔

ہر زخم ہے سینے کا ابھرنے والا
ہر درد ہے اب جلد ہی گزرنے والا

ہر سمت دیئے غم کے جلائیں آؤ
انسان کا مقدّر ہے سنورنے والا

—

اے رفعتِ تہذیب تجھے دیکھ لیا
اے اوجِ تمدّن تجھے ہم نے ...... پرکھا
ہے یہ بھی اک اندازِ ترقی شائد
انساں ہی کی نظروں سے ہے انسان گرا

شاغل ادیب نظم اور غزل دونوں پر یکساں قابو رکھتے ہیں۔ ان کی غزل پر روایت کا اثر ہے لیکن ادھر ربع صدی میں غزل نے جو نئی کروٹ لی ہے ان کی غزلوں میں اس کی جھلک بھی مل جاتی ہے۔ رومانیت تو ان کی شاعری کا مجموعی عنصر ہے ہی۔ غزلوں میں بھی ان کی کارفرمائی ہے۔ چنانچہ اس نوعیت کے اشعار ان کی غزلوں میں مل جاتے ہیں۔ ؎

کل رات ہم کو نیند نہ آئی بجا مگر
کل شب رہے ہیں وہ بھی بہت بیقرار سے

لیکن ان کی غزلوں سے ایسے اشعار بھی پیش کئے جا سکتے ہیں جن سے ان کی بھرپور عصری حسیّت کا اظہار ہوتا ہے۔ انہوں نے زندگی کی تلخیوں، کرب و بلا اور سانحات و حادثات کو نہایت عمدگی کے ساتھ غزلوں میں سمو دیا ہے۔ لعض شاعروں کے ہاں غمِ جہاں کے بیان سے غزل روکھی پھیکی، بے رنگ اور سپاٹ ہو جاتی ہے۔ شاغل ادیب نے غزل کے مزاج کو برقرار رکھا ہے اور مسائلِ حیات کو پیش کرتے ہوئے تغزل سے بھی کنارہ کشی اختیار نہیں کی۔ یہ چند اشعار دیکھئے۔

صبح کھا جاتی ہے اور شام نگلتی ہے انہیں
وقت کے ماروں کو سکھ چین کہاں ہوتا ہے

شاغل ادیب! مجھ سے سبھی مل کے رو پڑے
پیکر ہوں اِن دنوں میں کئی حادثات کا

دردِ جہانِ عشق، غمِ تلخیٔ حیات
تیرے نثار! اب کسی غم کی کمی نہیں

دل تشنہ، ہونٹ خشک، امیدیں ہیں ریت ریت
یہ زیست ہم کو دوستو.... صحرا دکھائی دے

قومی ترقیات کے بارے میں عوام کو خوش فہمیوں اور غلط فہمیوں میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ہمارے سیاسی قائدین کے بلند بانگ دعوے، گھن گرج لئے ہوئے بیانات، چمکتی دمکتی تقاریر اور کھوکھلے نعرے.... ان سب کو ذہن میں رکھتے ہوئے شاغل ادیب کا یہ شعر پڑھیئے۔

ہر لب پہ جگمگاتے ہیں سورج کے تذکرے
یہ اور بات ہے کہ کہیں روشنی نہیں

اس دور میں نئے نئے علوم، سائنسی ایجادات اور صنعتی ترقیات کے باوصف فرد کی بے بسی کی ہمارے بیشتر شاعروں نے ترجمانی کی ہے۔ شاغل ادیب بھی کہتے ہیں۔

جس کا اب تک جواب بن نہ پڑا
ایک ایسا سوال ہیں ہم لوگ
دکھ جھپٹتے ہیں ہم پہ یوں، جیسے
اک غنیمت کا مال ہیں ہم لوگ

شاغلؔ ادیب اس کے باوجود زندگی اور حالات سے مایوس نہیں۔ وہ رجائیت پسند ہیں اور انہیں یقین ہے کہ آنے والا کل روشن ہوگا۔ آج حالات کیسے ہی ناگفتہ ہوں کل اجالے ہوں گے۔ تہذیب کا سویرا جلد آئے گا۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

ملیں گے ٹوٹ کے مجھ سے اجالے، دیکھو گے
مجھے گپھاؤں سے باہر نکال کر دیکھو

شاغلؔ ادیب! ہم نے چھوڑا ہے شب کو پیچھے
اپنے سفر کی منزل، تہذیب کا سویرا

شاغلؔ ادیب نے اپنی شاعری کو عام طور پر بوجھل، بے رنگ و بے کیف ہونے نہیں دیا۔ تشبیہات وغیرہ کا استعمال ان کے یہاں ہے۔ لیکن صنعت گری کے بلاوجہ استعمال سے انہوں نے اشعار کو گراں بار نہیں کیا ہے۔ کیونکہ انہیں اندازہ ہے کہ

شعری سفر میں کیا ہوا شاغلؔ نہ پوچھئے
صنعت گری کی دھن میں غزل ہوگئی سپاٹ

صنعت گری سے شاغلؔ ادیب نے کام نہ لیا ہو۔ مگر پھر بھی وہ اس کی دھن میں اپنے آپ کو نئی غزل کے منفی عناصر سے بچا ہی رکھیں تو ان کی شاعری کا رنگ

یقیناً اور نکھرے گا کیونکہ ان کے مجموعہ میں ایسے خوبصورت اشعار بھی ہیں ۔

شب نہ ٹپکے نہ ستارے نہ سہی، صبح کی گود
میرے اشکوں کے ستاروں سے تو بھر جائے گی

—

مدّت ہوئی گھر چھوڑے ہوئے مجھ کو مگر آج
کیا جانئے کیوں دل سے جدا گھر نہیں ہوتا

مجھے یقین ہے شاغل ادیب کا شعری سفر نئی منزلوں کی سمت گامزن رہیگا اور ان کے اس مجموعہ "دکھوں کا سمندر، سکھوں کا جزیرہ" کی ادبی حلقوں میں مناسب پذیرائی ہوگی ۔

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید
ایم، اے ۔ پی ایچ ڈی
صدر شعبۂ اردو
ایس وی یونیورسٹی، تروپتی

ڈاکٹر طیب انصاری صاحب
صدر شعبۂ اردو، فارسی و عربی
گورنمنٹ کالج، گلبرگہ (کرناٹک)

شاغل ادیب کی شاعری

میری نظر میں

شاغل ادیب ادیب صاحب اردو کے کہنہ مشق شعراء میں سے ہیں۔ ان کی مشقِ سخن ایک طویل عرصہ پر محیط ہے۔ اردو کے بیشتر رسائل میں ان کا کلام شائع ہوتا رہا ہے۔ اور ان کے پڑھنے اور جاننے والوں کی بھی خاصی تعداد موجود ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ کسی بھی رسمی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔

شاغل ادیب صاحب قبل ازیں دو مقدس اور متبرک نعتوں اور منقبتوں کے مجموعے "ذکرِ اعظم" اور "دربارِ کرم" علمی، ادبی اور مذہبی حلقوں میں پیش کر چکے ہیں، دادِ سخن کے ساتھ ثوابِ دارین کے بھی مستحق ہیں۔ صالح اور صحت مند ادب کی یہی افادیت ہے کہ اس کی وجہ سے مقبولیت حاصل ہوتی ہے وہیں اس کا اجرِ نیک بھی ملتا ہے۔ اب جو نیا شعری مجموعہ "دکھوں کا سمندر، سکھوں کا جزیرہ" منظرِ عام پر آ رہا ہے تو میں بلا تامل کہوں گا کہ اس مجموعۂ شعری کے بعد انکی "مقبولیت" اور "قبولیت" میں انشاءاللہ اضافہ ہی ہوگا۔

اچھا شعر میرے نزدیک وہی ہے جو ظاہری اعتبار سے حسین اور خوبصورت ہے اور باطنی طور پر روح پرور اور قلب کو گرمانے والا۔ افلاطون نے غالباً یہی بات

اپنے انداز میں کہی تھی کہ حسن بھی بذات خود ایک قدر ہے۔ صداقت، خیر، رحم، عدل و انصاف حسن ہی کے مترادفات ہیں۔ حسن کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ حسنِ ذات اور حسنِ صفات دونوں کا مجموعہ ہو۔

اکثر حسن کی تلاش ظاہر میں کی جاتی ہے۔ چنانچہ ادب میں بھی زبان، ہیئت اور اسلوب کو حسن کا معیار قرار دیا گیا۔ بعضوں نے معنی میں حسن کی تلاش کی ہے۔ دونوں ہی کا منشا شہ پارے میں حسن کی جلوہ گری ہے۔ ظاہری حسن کے اس تصور نے نرے ادب کی تخلیق کی ہے۔ ابتذال اور عریانیت نے جگہ پائی اور محض حظ کا حصول منشائے شعری قرار پایا۔ حالانکہ اس طرح کا حظ بازارِ حسن کی سیر سے بھی حاصل ہو سکتا ہے یا کسی مجرے کی محفل میں شرکت سے بھی۔ اس طرح کے حصولِ حظ کے لئے شعر کی رسوائی کیوں مقصود ٹھہری۔ جس طرح افادی / مقصدی ادب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ادب واعظ نہیں ہے۔ جواباً عرض ہے کہ ادب رقاصہ کے پاؤں کا گھنگھرو بھی تو نہیں ہے۔ ادب اسی وقت با ادب ہوگا جو ظاہری اور معنوی اعتبار سے حسین ہو۔ بلاشبہ ارسطو نے شعر میں حظ کے پہلو پر زور دیا ہے لیکن اگر کوئی فواحش، ابتذال، عریانیت اور اسی طرح کے مکروہات ہی کے ذریعہ حظ اٹھانا چاہتا ہے تو ظاہر ہے وہ نفسیاتی طور پر مریض ہے۔ اور اس طرح کے حظ میں پائیداری بھی نہیں ہے۔ یہ اندازِ فکر نہ صرف منفی ہے بلکہ مضرت رساں بھی ہے۔ یہ بات میرے لئے باعثِ طمانیت بھی ہے اور باعثِ مسرت بھی کہ شاغل ادیب صاحب کے یہاں حسن کا مفہوم مثبت، پاکیزہ اور تعمیری ہے۔ لفظ و بیان کا حسن بھی اس مجموعۂ شعر میں آپ کو ملے گا اور معنی و مفہوم کا حسن بھی۔ اس کی بنیادی وجہ وہ ستھرا اور پاکیزہ ماحول ہے جس میں ادیب صاحب کی ذہنی اور شعری تربیت ہوئی ہے۔ میری بات کے ثبوت

ملا عرض ہیکہ انہوں نے "ذکرِ اعظم" سے اپنے شعری سفر کا آغاز کیا ہے۔ "ذکرِ اعظم" اور "دربارِ کرم" انکے ایسے شعری مجموعے ہیں جن کا مطالعہ باوضو ہونا چاہیئے۔ اب زیرِ نظر مجموعۂ کلام "دکھوں کا سمندر سکھوں کا جزیرہ" بھی جو ان کی نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے، افکار کے لحاظ سے ذہنِ انسانی میں زندگی کا پاکیزہ تصور ابھارتا ہے۔ شاغلؔ ادیب صاحب کے اس مجموعۂ کلام کا آغاز بھی حمد شریف سے ہے۔ نعتؐ کے علاوہ منقبتؓ بھی شامل ہے۔ یہ آغاز محض روایتی نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔ بلکہ ادیبؔ چونکہ نسبتِ خاص بھی رکھتے ہیں اس لئے وہ پورے خشوع و خضوع کے ساتھ ذاتِ باری تعالیٰ کے آگے سر بسجود ہیں۔ خیال و فکر کی یہ پاکیزگی شروع سے آخر تک ملے گی۔ چاہے وہ رباعی کہہ رہے ہوں یا قطعہ یا پھر غزل۔ چند اشعار غزل ہی سے پیشِ خدمت ہیں۔

ہیں جہاں طاری ظلمتیں شاغلؔ
ہم وہیں روشنی کی بات کریں

—

بڑھ گئے کچھ اور شاغلؔ، جانبِ زنداں جو ہم
تقویت کچھ اور دل کے حوصلے پاتے رہے

—

ہم سحر کے دیوانے جس طرف کو چلتے ہیں
ہر قدم مہ و انجم، پاؤں پر مچلتے ہیں

—

تمام رات رہی سر پہ دھوپ ہی شاغلؔ
مرے وجود پہ سورج یہ کون اچھال گیا

زندگی میں ہر رہِ پُر پیچ سے گزرے ہیں ہم
کوئی بھی مشکل نہیں ہے ہم کو مشکل آج کل

انداز کا تیکھا پن ملاحظہ کیجئے

جسم خالی ہے جان ہے خالی
زندگی کا مکان ہے خالی

—

پی گئے یوں تو ہم سمندر بھی
شاغلؔ اپنی بجھی نہ لیکن پیاس

—

شاعری اصل میں ہے کوہِ کنی
پھر بھی ہم کو یہ لفظ پیارا ہے

شاغلؔ صاحب کے یہاں فکر و خیال کا یہ تنوع اور پاکیزگی، اصل میں ان کے شعر کی خوبی ہے۔ اور یہی خوبی ان کے اشعار کو زندہ و تابندہ رکھے گی۔ ویسے تعلّی ہر شاعر کا شیوہ رہی ہے لیکن شاغلؔ ادیب صاحب کے یہاں یہ دعویٰ محض نہیں ہے۔ وہ ایسا کہتے میں حق بجانب ہیں۔

یہ تعلّی نہیں، ہے سچ شاغلؔ
شاعرِ باکمال ہیں ہم لوگ

شاغلؔ ادیب نے اپنے اس مجموعہ کا نام "دکھوں کا سمندر سکھوں کا جزیرہ" تجویز کیا ہے۔ لگتا ہے زمانے نے انہیں دکھ زیادہ اور سُکھ کم دیا ہے۔ ان کی شاعری میں مجھے زندگی کا اثبات نظر آیا۔ یہ ان کی حوصلہ مندی کا احساس

دلاتا ہے۔ شعر کے لئے دکھ سے لڑنا اور دکھ پر فتح پانا انسان کا مقدّر ہے۔ لیکن اس کے لئے عزم و حوصلہ کی ضرورت ہے۔ میں سمجھتا ہوں شاغل ادیب کے ساتھ ساتھ ہمارے دوسرے شعراء بھی حالی، شبلی، اور اقبال کی طرح حیات سے زور آزمائی کا حوصلہ پیدا کریں تو فتح دور نہیں۔

نچھاور ہوگی انساں تجھ پہ رفعت دونوں عالم کی
اگر اونچا تری گفتار کا معیار ہو جائے

ڈاکٹر طیّب انصاری
صدر شعبۂ اردو، فارسی، و عربی
گورنمنٹ کالج، گلبرگہ
(کرناٹک)

۱۱۶ - ڈی، ایوان شاہی
گلبرگہ (کرناٹکا) 585102

لوح و قلم

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

فیض احمد فیض

○

- ○ حمد
- ○ نعت ؐ
- ○ منقبت ؓ
- ○ سلام ؑ
- ○ مرثیے
- ○ دوہے اور
- ○ نظمیں

○

حمد

منجدھار میں انساں کو، تُو ہی تو تراتا ہے
ہر ڈوبنے والے کو، مولا تُو بچاتا ہے

رحمت کا تری آقا، محتاج ہے ہر کوئی
شاہوں کو غلاموں کو، تیرا ہی سہارا ہے

تُو آگ جہنم کی، برساتا ہے منکر پر
نمرود کی آتش کو، گلشن بھی بناتا ہے

ہر چیز کا ہے خالق، ہے سب کا محافظ تُو
تُو پیٹ میں مچھلی کے، یونسؑ کو جِلاتا ہے

بدکار بچیں گے کیا، وہ ڈوب ہی جائیں گے
تو نوحؑ کی کشتی کو، طوفاں میں تراتا ہے

تنبیہ بھی کرتا ہے ، مجرم کو بھی جرموں پہ
عاصی کو تو ہی یارب ، سینے سے لگاتا ہے

عزّت ملے ہے تجھ سے ، دیتا ہے تو ہی ذلت
جھوٹے کو گرائے تو ، سچّوں کو اٹھاتا ہے

مرضی بِنا اے آقا ، پتّہ بھی نہ ہِل پائے
چاہے تو اگر پل میں ، دنیا کو ہِلاتا ہے

کیا حمد لکھے تیری ، یہ شاغلِ عاصی بھی
ہے تیرا کرم اُس پر ، تو ہی تو لکھاتا ہے

نعت

دنیا کو سبق دیتا ہے کردارِ محمدؐ
بے عیب ہیں بے مثل ہیں اطوارِ محمدؐ

خالی نہ گئی کوئی طلب کوئی تمنا
سرچشمۂ الطاف ہے سرکارِ محمدؐ

مایوس نہ لوٹا کوئی اک فرد یہاں سے
دربار ہے داتا کا وہ دربارِ... محمدؐ

سنسار میں کیا خاک سکوں اس کو ملے گا
تڑپے گا شب و روز گنہگارِ محمدؐ

بیماروں نے ہر وقت شفا پائی ہے اس سے
دنیا کا مسیحا ہوا... بیمارِ محمدؐ

آرام ہمیشہ رہا تقدیر میں اس کی
بے فکر ہمیشہ رہا سرشارِ محمدؐ

سیراب کبھی تو نگہہِ شوق ہو میری
یارب ! کبھی تو ہو سکے مجھے دیدارِ محمدؐ

ہیں ہیچ سبھی جنّ و بشر آپؐ کے آگے
اعلیٰ ہے بہت اونچا ہے معیارِ محمد

ہے حُبِّ نبیؐ حُبِّ خدا اصل میں شاغل
اس بات سے واقف ہے پرستارِ محمدؐ

○

منقبت

حضرت شیخ علاؤ الدین انصاریؒ عرف حضرت لاڈلے مشائخؒ

الند شریف

اس منقبتؒ کے بیشتر بند ڈاکٹر طیب انصاری صاحب کی تصنیف "مخدوم علاؤ الدین انصاریؒ" پر مبنی ہیں۔ (ش ۔ ۱۰)

دربار ہے نرالا ترا شیخ لاڈلےؒ
پاتے ہیں فیض تجھ سے دوانے سبھی ترے

اخلاص کا نمونہ ترا مستقر الند
ہے پیار کا ~~اخلاق~~ پیغامبر الند
ہر قوم کے لئے ہے عقیدت کا گھر الند

در تیرا ہے کھلا ہوا ہر فرد کے لئے
دربار ہے نرالا ترا شیخ لاڈلےؒ

چوکھٹ پہ تیری آج جھکا ہے ہر ایک سر
ہو کیوں نہ احترام ترا، تو ہے معتبر
دنیا تری دوانی ہے القصہ مختصر

قربان سب ہیں تیری حسیں بارگاہ کے
دربار ہے نرالا ترا شیخ لاڈلے

تعمیلِ حکمِ پیر میں تو آیا تھا یہاں
تبلیغِ دینِ حق میں لگادی تھی تو نے جاں
مخدوم تیرے درس کے تھے سب ہی قدرداں

تو ایک تھا مگر ترے شیدا ہزار تھے
دربار ہے نرالا ترا شیخ لاڈلے

تولیدِ قدس تیری کرامت ہی تھی شہا
تڑکے پہ نور کے گئی ماں تیری یو کھلا
آئی معاً صدا کہ گھر اب پیر آ گیا

جوہر تری بزرگی کے پھر سب پہ کھل گئے
دربار ہے نرالا ترا شیخ لاڈلے

رسیا نہیں تھا صرف تُو قدرت کے نور کا
دوشیزۂ دکن پہ ترا دل بھی آگیا
بعدِ نماز جس کا نظارہ کیا سدا

روشن مجاز میں تھے حقیقت کے قمقمے
دربار ہے نرالا ترا شیخ لاڈلے

روشن ضمیر، صاحبِ دل، صاحبِ نظر
توصیف تیری کر نہیں سکتا کوئی بشر
تُو تھا خلیفہ پھر بھی ہوا پیرِ با ہنر

دیکھے ہیں اپنے عہد میں انوار خضر کے
دربار ہے نرالا ترا شیخ لاڈلے

○

گمانِ منزل

چھٹ گیا رنج و غم کا اندھیارا
دیپ آشا کے ہو گئے روشن
سائے میں پرچم مسرت کے
جھوم کر گیت گا اٹھا جیون

حوصلے ہیں جوان اور ہمت
مسکراتی ہے گنگناتی ہے
"ہار" کے بدلے بدلے ہیں تیور
"جیت" ہنس ہنس کے بڑھتی جاتی ہے

کر نہ اب دیر، ساتھی اٹھ اب اٹھ
پا بہ جولاں "نیا زمانہ" ہے
روشنی "صبحِ نو" کی پھیلی ہے
لب پہ رقصاں "نیا ترانہ" ہے

ہاں! یہی آج کہہ رہا ہے دل
بڑھ چلو، دور اب نہیں منزل

○

تلاشِ سکوں

نہ پایا سکوں قلبِ مضطر نے میرے

جواں سال رنگیں بہاروں میں دیکھا
حسیں اور دلکش نظاروں میں دیکھا
چمکتے ہوئے چاند تاروں میں دیکھا

نہ پایا سکوں قلبِ مضطر نے میرے

سرور و خوشی کے فسانوں میں ڈھونڈا
حظ و عیش کی داستانوں میں ڈھونڈا
عنادل کے شیریں ترانوں میں ڈھونڈا

نہ پایا سکوں قلبِ مضطر نے میرے

مہکتی ہوئی کاکلوں سی فضا میں
گلستاں کی بدمست چنچل ہوا میں
پپیہے کی دلکش رسیلی صدا میں

نہ پایا سکوں قلبِ مضطر نے میرے

مساجد میں گرجاؤں میں بتکدوں میں
یہ مستی نظر کیف زا میکدوں میں
طرب گاہوں میں اور عشرتکدوں میں

نہ پایا سکوں قلبِ مضطر نے میرے

آج کا کوی

مرے ساتھیو! آج کا ہوں کوی میں
مجھے مالداروں سے ہے سخت نفرت
محبت ہے بے حد مجھے جھونپڑوں سے
مجھے محلوں سے ہے نہایت کراہت

سخن میں مرے کچھ ارادے ہیں ایسے
جو بدلیں گے سرمائے کا نظم اک دن
مرے گیتوں میں ہیں کچھ انگارے ایسے
جو پھونکیں گے سرمائے کی بزم اک دن

کوی ہوں کوی بے کسوں کا سہارا
مجھے ان کی خاطر ہے مرنا ..... گوارا

○

تم سلامت رہو

اپنے پہلے بچے شیخ منیر الدین کی پہلی سالگرہ پر

گیت ہونٹوں پہ سَو مچل اُٹھے
زندگی مسکرا کے جھوم .... اٹھی
سینے میں سَو چراغ جل اُٹھے
چھٹ گئی رنج و غم کی تاریکی

آج ہر گام پر مسرّت ہے
منزلیں زمزمے سناتی ہیں
روح رقصاں، نفس نفس شاداں
دھڑکنیں جھوم جھوم جاتی ہیں

حالتِ زیبؔ آج کیا کہیے
خندۂ گل سجا ہے ہونٹوں پر
رُخ پہ ہے اک ہجومِ شادابی
حور سی ڈولتی ہے رہ رہ کر

[illegible] میری شریک حیات

اور دادی[۲] کی بوڑھی آنکھوں میں
رقصاں انوارِ شفقت کا اک عالم
گود میں ہے منیر اور لب پر
سو دعائیں مچلتی ہیں ہر دم

گنگناتی ہے اب یہی دھرتی
اور گاتے ہیں اب یہی ستارے
"تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار"

ع[۲] میری دادی جان

O

چاند

اے حسین چاند ! اے آسماں کے صنم
ہے خبر کچھ تجھے
کتنا آباد تھا سومناتِ جنوں
آرزو سے تری
اک ترے پیار سے

اے حسین چاند ! اے آسماں کے صنم
تجھکو معلوم کیا
کتنی شدّت سے پوجا تھا میں نے تجھے
سالہا سال سے
صدیوں سے ان گنت

اے حسیں چاند ! اے آسماں کے صنم
ہے تجھے کچھ پتہ
آج ہوں میں تری
بزم میں جلوہ گر
ہوں جنوں ابتدا ، بندگی انتہا

اے مرے چاند ! اے آسماں کے صنم
یہ مگر کیا ہوا
تو کہ خاموش ہے ، سرد و ساکت ہے تو
جیسے پروا تجھے اب نہیں ہے کوئی
پیار کی
بندگی کی مری

اے حسیں چاند ! اے آسماں کے صنم
بول کچھ تو ذرا
تو بھی شاید زمیں کا ہی اک چاند ہے
خود غرض ، خود نما
بے حس و بے وفا

سپنوں کا نگر ہے کہ یہ شمشان ہے بابا
ہر گام پہ جلتا ہوا انسان ہے بابا

لاحول پڑھیں کس پہ دعائیں دیں کسے ہم
اس دور کا انسان بھی شیطان ہے بابا

آرام کڑی دھوپ میں ہے مجھکو مگر وہ
بادل کی گھنی چھاؤں میں حیران ہے بابا

جب بات وہ کرتا ہے تو لگتا ہے فلاطون
یوں دیکھنے میں وہ بڑا نادان ہے بابا

جس رشتے کی تقدیس پہ قربان ہے سنسار
اُس رشتے سے افسوس وہ انجان ہے بابا

شاغلؔ کا ادب میں بھی بڑا نام ہوا ہے
شاغلؔ پہ بہت آپ کا احسان ہے بابا

○

خوشیاں جیسے ساتھ جیون کا سدا دیتی نہیں
دستِ غم سے ویسے ہی چھُٹ جائے گا دامن ترا

ہو نہ مغموم و پریشاں یوں ہی اُٹھ اب ہم نشیں
اُٹھ نہ کر تو دیر اب، اٹھ مسکرا اور گیت گا

دیکھ اب ڈھلنے لگی شب کی بھیانک تیرگی
دیکھ صبحِ کیف زا ہونے لگی اب آشکار

نذرِ جگر

شہنشاہِ تغزل حضرت جگر مرادآبادی کی وفات پر

○

خموش و سر بہ گریباں ہیں اہلِ بزمِ جہاں
اک ایک اٹھتا چلا جا رہا ہے چپکے سے
اجل کہ بڑھتی ہی جاتی ہے بانہیں پھیلائے
دلِ حیات کہ رہ رہ کے بیٹھ جاتا ہے

فغاں بہ لب ہے سخن اور ادب ہے افسردہ
غزل کی آنکھ سے بہتا ہے خون کا دریا
اداس اداس ہے فن اور بجھا بجھا ہے ہنر
ربابِ شعر سے اب پھوٹ بہتے ہیں نوحے

ہیں ذہن و فکر و نظر آج شاغلِ ماتم
دل و جگر نے بھی دم توڑ ہی دیا تھک کے

ضیائے "شعلۂ طور" اور نہ "آتشِ گل" اب
جہاں سے اٹھ گئی رنگینیٔ تغزّل اب

غضب کہ جاتا رہا اب جگر امیرِ فن
ستم کہ چھن گیا ہم سے امامِ فکر و سخن

آجا میری زہرہ آجا

آجا میری زہرہ آجا
زیست کا مجھ کو راز بتا جا
پاؤں تھک کے رک جاتے ہیں
مجھ کو منزل پہ پہنچا جا
آجا میری زہرہ آجا

چشم دل خوں بار ہے تجھ بن
جیون اک آزار ہے... تجھ بن
آزار و غم کے سینے.... پر
پرچم راحت کا لہرا.... جا
آجا میری زہرہ آجا

پوچھ نہ مایوسی کا عالم
ہر سو خاموشی کا...... عالم
تجھ بن ساکت سارا جل تھل
آجا ہلچل ایک مچا جا
آجا میری زہرہ آجا

تیرہ تیرہ آس کی دنیا
سرد و خموش احساس کی دنیا
تجھ بن مردہ دھڑکن دھڑکن
سینے میں شعلے بھڑکا جا
آجا میری زہرہ آجا

بچپن کے وہ سپنے سارے
سندر سندر پیارے پیارے
نقش ہیں جن کے دل پر اب بھی
آجا کر لیں پورے آجا
آجا میری زہرہ آجا

اپنے ساتھی اپنے دشمن
ٹوٹ چکے اب سارے بندھن
جیون بھی تجھ بن بیگانہ
آجا دستِ شوق بڑھا جا
آجا میری زہرہ آجا

آجا دنیا ایک بسائیں
پریت کے اس میں چاند کھلائیں

بن جائیں ہم جیون ساتھی
دل سے دل کو راہ سجھائیں

اور یہ سماجی طوق وسلاسل
گرم دجواں خوں سے پگھلائیں
اور یہ حد کے سڑے گلے میں
کھولیں پیار کا امرت آجا

آجا میری زہرہ آجا
آجا میری زہرہ آجا

○

تیرگی کا زہر

پنڈت جواہر لال نہرو کی وفاتِ حسرت آیات ــــ پر

○

نشاطِ زیست کی پُر نور شاہراہوں میں
اجل کی تیرگی کا زہر کیسے پھیل گیا
اداسی لوٹی یہ کس قدر شہرِ دل پر ... آج
یہ کیسے آج بجھا آفتاب بھارت ــــ کا

ہے روح روح فسردہ ' بدن بدن مردہ
ہر ایک ذہن پریشاں ہے ' چشم ہے پُرنم
اداس اداس ہے گنگا ' اداس ہے جمنا
اک ایک نقشِ اجنتا ہے سر بسر ماتم
گلاب آج ہے کشمیر کا بجھا ہر اک ــــ
ہے آج تاج کے رخ پر بھی بیوگی کا ..... غم

یہ یک بیک خضرِ امن اٹھ گیا ــــ کیسے ؟
یہ کیا ہوا کہ پیمبر خلوص کا ...... روٹھا
یہ کیا ہوا کہ گیا اب جواہرِ اعظم
یہ کیا کہ مر گیا آج اک عظیم راہنما

○

خالی مکاں

مجسم خموشی
سراپا اداسی
چھتیں ہیں بجھی سی
فسردہ فسردہ ہے دیوار ہر اک

دریچے ہیں خاموش
در بے صدا ہیں
ہر اک سمت چھایا ہے سناٹا گہرا

مجسم خموشی
سراپا اداسی
یہ خالی مکاں ہے
کہ اجڑا کوئی دل

عقیدت کے پھول

بزمِ جیون حیدرآباد کے زیرِ اہتمام منعقدہ حضرت خورشید احمد جامی کی خیر مقدمی تقریب میں پڑھی گئی ۔ (مش ۱۰)

سلام ! جامیؔ فنکار شاعرِ اعظم
ترے حضور عقیدت کے پھول لائے .. ہم

کہیے کیا ترے فن کی کلام کی عظمت
کہاں یہ ہم کہاں تیرے مقام کی عظمت

چمن چمن ترے نغمے بہ محفلِ اردو
کمالِ فن کی ترے ہے نفس نفس خوشبو

ہنر کے شہر میں تُو نے اُگائے چاند نئے
دیارِ فکر میں تُو نے سجائے چاند نئے

ہے نظم نظم تری شعر و فن کا آئینہ
غزل غزل ہے تری یا صنم ہے آزر کا

بڑھی کچھ اور تری شہرتِ ادب جامیؔ
بڑھایا تُو نے قدِ عظمتِ ادب جامیؔ

سپنوں کے خول

آج غمِ خانۂ زندگانی میں پھر
جل اٹھے تیری یادوں کے بجھتے چراغ
رقص کرنے لگی بزمِ شوق و جنوں
پھر کھنک اٹھے احساسِ دل کے ایاغ

میں رہِ جستجو میں بھٹکتا ہوا
یک بیک شہر میں آگیا تھا ترے
پاؤں تھک سے گئے شوق رک سا گیا
اٹھیں نظریں تو پایا تجھے سامنے

دل نے تھپکی دی آہستہ اور یہ کہا
"مل گئی تجھ کو منزل تری مل گئی"
خول سپنوں کے تخئیل پر چڑھ گئے
زندگی کو مری زندگی مل گئی

جھول اٹھیں خلاء میں وہ گھڑیاں حسیں
لمحے خوش رنگ پھر ذہن پر چھا گئے
بانہیں ماضی کی جانب بڑھیں حال کی
زخمِ دل گیت دہرا اٹھے پیار کے

کتنی شدت سے چاہا تھا میں نے تجھے
کتنا آباد تھا سومنات جنوں
وعدے تو نے بھی مجھ سے کئے تھے بہت
اور سوچا تھا میں نے بھی "تیرا رہوں"

میرے ہمدم! مگر شہر والے ترے
دے نہ پائے مجھے اذنِ قرب و قرار
بڑھ سکی تو بھی آگے نہ اجداد سے
آ گیا کام فرسودہ رسموں کے پیار

آج غم خانۂ زندگانی میں پھر
جل اٹھے تیری یادوں کے بجھتے چراغ
رقص کرنے لگی بزمِ شوق و جنوں
پھر کھنک اٹھے احساسِ دل کے ایاغ

مرثیہ

اپنے تین روزہ پسر مخدوم بشیر کی وفات پر

کیوں تین دن میں روٹھ گیا میرے خوبرو
تا عمر آنکھ روئے گی تیرے لئے لہو

تھی دید مختصر تری لیکن یہ حال ہے
پھرتا ہے آج بھی مری آنکھوں میں تو ہی تو

آنے سے تیرے رات میں تھی ہر سو روشنی
جانے سے تیرے دن میں اندھیرا ہے چار سو

اس تین دن میں سپنے بُنے ہم نے تین سَو (۳۰۰)
اے کاش! دئے نہ جاتا تو یوں داغِ آرزو

سر خانداں کا تجھ سے ہمالہ سا تھا بلند
تھا باپ کا وقار، تو تھا ماں کی آبرو

پا جاتے چار بھائی ترے فیضِ پنجتن
مخدوم ساتھ ان کے جواں ہوتا نیر تو

معصوم بہنیں روتی ہیں ثنا غل کے ساتھ ساتھ
آیا بھی اور گیا بھی اچانک کہاں یہ تو

نذرِ زورؔ مرحوم

یومِ ڈاکٹر زورؔ مرحوم کے مشاعرے میں پڑھی گئی

○

جہاں کہیں بھی چلی عظمتِ دکن کی بات
کچھ اور نکھری وہاں زورِؔ علم و فن کی بات

وہ زورؔ جو تھے درخشاں ستارۂ اردو
وہ زورؔ جو تھے مکمل ادارۂ اردو

وہ زورؔ جن کی تھی تحقیق شاہکارِ سخن
وہ زورؔ جن کی تھی توفیق یادگارِ سخن

وہ زورؔ بخت کھنڈر کا جنھوں نے چمکایا
وہ زورؔ کھوج نکالا جنھوں نے اک ہیرا

بغیرِ زورؔ ادھوری ہے فکر و فن کی بات
بغیر ان کے مکمل نہیں دکن کی بات

وقار و فخرِ ہنر، شانِ زورؔ باقی ہے
وہ دیکھو آج بھی ایوانِ زورؔ باقی ہے

○

آدمی

قتل نے
خون نے
ظلم نے
سر اٹھایا بہت
یوں ہی ہر دور میں
آدمی
قتل ہوتا رہا
ظلم سہتا رہا
عدل کچلا گیا
اور حق چھن گئے
اور اصولوں کے سینے پہ اٹھتا رہا
اک علم جبر کا
ہاں مگر

یک بیک
قتل کے خون کے ظلم کے دور میں
آدمی جاگ اٹھا
تھرتھرایا فلک
اور زمیں کانپ اٹھی
پھر اصولوں نے
حق اور انصاف سے
سر کچل ہی دیا
قتل کا
خون کا
ظلم کا

○

تہنیت

استادِ محترم جناب حسینی شاہد مرحوم کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملنے پر کہی گئی

نظر نظر میں ہے اک ایک ذرّہ اب روشن
خوشا کہ ٹوٹ گیا آج تیرگی کا فسوں
قدم قدم پہ ہے مینارِ نور کا پرتو
ہے شہر آج اجالوں کا، رہگزارِ جنوں

ہے آج قافلۂ آرزو بہت مسرور
کہ ایک راہرِوِ شوق کامیاب ہوا
طلب کی راہ گزر میں جلے چراغ کئی
پتہ حیات کی منزل کا آج مل ہی گیا

ہر ایک لب پہ مسرت کا آج ہے مژدہ
فلک پہ اڑنے لگے صاحب ہنر شاہد
نوید! شعر و ادب کا دیار ہے رقصاں
خوشا خوشا کہ بنے آج ڈاکٹر شاہد

سفید خون

میں بھی ہوں
آدمی اک عجب دوستو
ہو کے سنسار سے
اک ذرا سا جدا
رو رہا ہوں
سمندر لہو کا سدا
اور لہو سے مرے
تر بتر گھر مرا ہو گیا
ہاں مگر
اس مرے گھر سے سنسار کو
کیا غرض
خون تو
آج سب کا
ہوا ہے سفید

○

گاندھی جی کی نذر

اے اہنسا کے پجاری ' اے سکوں کے دیوتا
اتحاد و دوستی کی راہ میں تو مِٹ گیا

کتنی بے رحمی سے مارا آہ ! ظالم نے تجھے
عقل کے اندھے کو حاصل کیا ہوا اس پاپ سے

قدرِ انساں ہوتی ہے انسان مرجانے کے بعد
سوچتا ہے رند گھر کی ہوش میں آنے کے بعد

روح لرزاں ' چشم پُرنم ' دل فگارِ رنج و غم
اُٹھ رہا ہے آج ہر سینے سے طوفانِ الم

مہر و مہ غمگین ' افسردہ زمین و آسماں
چھوٹتے ہیں آج لب سے ہند کے آہ و فغاں

آج تیرے سوگ میں نالاں ہے ہر اک بھارتی
آہ ! تجھ بن کس قدر ویراں ہے سابرمتی

دیوی بھی جمہور کی ہے کس قدر افسردہ آج
لے سکوں کے دیوتا ' باپو عقیدت کا خراج

○

تضحیک

تجھ سے پہلے بھی تھا معمورۂ ہستی ویراں
تجھ سے مل کے بھی نہ آباد ہوا.... دل میرا
تجھ سے پہلے بھی تھی تصویرِ تمنّا بے رنگ
تجھ کو پا کے بھی ہر اک خواب ادھورا ہی رہا

ہے گلہ تجھ سے مجھے اور نہ شکایت کوئی
شوق کو میرے ہی شاید نہ سکوں راس آیا
میں کہ ہوں اپنے ہی احساسِ وفا سے نالاں
خوش مرے پیار کو رنگِ غم و یاس آیا

ہاں! مگر تجھ سے یہ کہہ دوں تو برا بھی کیا ہے
تُو نے اک جذبۂ الفت کا اڑایا ہے مذاق
پیار تجھ کو نہ سہی مجھ سے مگر تُو نے دوست
ایک فنکار کی عظمت کا اڑایا ہے مذاق

کی تھی تعریف یہ کیوں تو نے مری نظموں کی
تو نے غزلوں کو مری یوں ہی سراہا کیوں تھا
کیوں ان افسانوں کو سینے سے لگایا تو نے
جن میں تھا میں نے ترے پیار کا امرت گھولا

اے مرے دوست مری جھوٹی پرستارِ فن
ایک فنکار کی توقیر ہے اس کا فن ہی
اے کہ تو نے نہ دیا ہوتا مجھے تلخ فریب
اے کہ تو ایسا تو توہین نہ کرتی فن کی

○

چادر

سرِ راہ کل ایک ننگی بھکارن
چلی جا رہی تھی
سبھی ہنس رہے تھے
تماشائی تھے سب
مگر دے نہ پائی
کسی نے بھی بڑھ کر
اُسے
ایک چادر

۱۱ جنوری سنہ ۱۹۶۶ء

لال بہادر شاستری کی وفات پر

○

نسیم صبح لے آئی ہے آج کیسی خبر
روش روش بچھی صف درد و آہ کی یارو
ستم اجل نے یہ توڑا ہے آج پھر کس پر
فغاں و کرب میں ڈوبی ہے زندگی یارو

دماغ آج پریشاں ہے، قلب ہے مضطر
ہر اک جبیں پہ تردّد ہے اک، سکوں کی جگہ
غضب یہ ٹوٹا ہے کیسا ہر ایک سینے پر
بدن بدن میں ہے سیماب اب لہو کی جگہ

ہوا ہے آج نہ جانے یہ کیا وطن سے دور
خلوص کا یہ وطن، ہند کا محب لٹا
یہ کیا ہوا کہ یکایک ہوا جہاں رنجور
غضب غضب کہ امیرِ تلاشِ امن گیا

○

پیار کی موت

(سانیٹ)

میری ہمدم! ہے یہ اچھا کہ تمہیں بھولوں میں
مجھ سے مدت سے ملیں تم نہ مجھے بھی کوئی
چاہ پہلی سی رہی تم سے نہ وہ آس رہی
ہے مناسب کہ تمہیں اب نہ کبھی چھولوں میں

شب کی تاریکی میں کل ایک ستارا ٹوٹا
دوسرے لمحہ تمہارے وہ محبت نامے
شمع کی نذر ہوئے جاتے تھے اک اک کرکے
دور سناٹے میں کتا کوئی رو اٹھا تھا

رشکِ صد ہوش تھی دیوانگی کل رات مری
آج تعبیرِ حقیقت لئے آئی ہے سحر
سارے اخباروں میں شادی کی تمہاری ہے خبر
پیش بندی اجلِ شوق کی سچ ہی نکلی

ہے بجا ٹوٹی ہوئی آس کو کفنا دوں میں
قبرِ ماضی میں مرے پیار کو دفنا دوں میں

نذرِ حسینؓ

یزیدِ وقت کے ستم کو اٹھائے جاتے ہیں
حسینؓ! شانِ صداقت بڑھائے جاتے ہیں

خدا کے نام پہ سب کچھ لٹائے جاتے ہیں
فلاحِ دیں کے لئے کام آئے جاتے ہیں

ہزاروں شمرؔ یزیدی وقار کی خاطر
فقط نہتّے بہتّرؓ کو ڈھائے جاتے ہیں

ہے جن کی مِلک میں کوثر، فرات پہ افسوس
انہیں کے واسطے پہرے بٹھائے جاتے ہیں

سلام! ان کی دلیری کو اور عظمت کو
خلافِ ظلم جو آواز اٹھائے جاتے ہیں

ہوا زمانہ مگر پھر بھی "ذکرِ کربل" پر
ہم آہ! آج بھی آنسو بہائے جاتے ہیں

دکھائی دیتا ہے شاغلؔ حسینؓ کا کردار
خدا کی راہ میں جب سر کٹائے جاتے ہیں

جھوٹی شان کے شہزادو

جھوٹی شان کے شہزادو تم
اب بھی سنبھلو
دیکھو
چاند بھی تم جیسا ہی
جھوٹی شان کا شہزادہ ہے
وہ
سورج کی چھایا اوڑھے
رات کو چھپ کر
گھر گھر جا کر
پھرتا ہے بس چوری کرتا
جھوٹی شان کے شہزادو تم
اب بھی سنبھلو
○

دیپاولی دوہے

دیوالی کی جوت جگے ہے، ملے گلے ہر کوئے
ساجن تیری دوری میں من میرا پاگل ہوئے

کیا پوچھو ہو مترو مجھ سے دیوالی ہے کیا لائے
سب کے گھر میں جگمگ جگمگ مجھکو اندھیرا کھائے

دیوالی کی رین نرالی، اک اک پل مسکائے
ہوگا اچھا ایسے میں گر تو بھی ساجن آئے

دیوالی کی رات ہے ٹھنڈی، ٹھٹھرے جائیں لوگ
میرے من کا لاوا پوچھے ہوگا کب سنجوگ

نظموں غزلوں میں تو دکھایا شاغل جی نے زور
شعر و ادب میں ہوگا ان کے دوہوں کا بھی شور

نئے سال کا عہد

قومی یکجہتی کے پس منظر میں

نیا سال پھر آ رہا ہے رفیقو
بہ صد شوق ہم اس کا سواگت کریں گے
چلو عہد کر لیں یہ سب آج مل کر
سدا ایک ہو کے جئیں گے مریں گے

وطن اپنا یارو ہے جنّت کا منظر
وطن اپنی مسجد ہے، مندر ہے سندر
وطن اپنا دراصل گرجا ہے پیارا
وطن اپنا بے مثل ہے گردوارا
چلو عہد کر لیں یہ سب آج مل کر
سدا ایک ہو کر جئیں گے مریں گے

وطن اپنا اقبال کا ایک نغمہ
وطن اپنا ٹیگور کا پیارا سپنا
وطن اپنا تلسی کی فکر حسیں ہے
وطن کیفی کی نظم اک دل نشیں ہے

وطن اپنا غالب کا حسن تغزل
وطن اپنا میر تقی کا تحمل
وطن شہ ظفر کا مؤثر سخن ہے
وطن اپنا میرا کا غم گیں بھجن ہے
چلو عہد کر لیں یہ سب آج مل کر
سدا ایک ہو کر جیئیں گے مریں گے

وطن قطب شاہی کے دل کی لگن ہے
وطن لکشمی رانی جھانسی کا فن ہے
وطن اپنا اکبر کا دین الٰہی
وطن اپنا خواجہ کی گوتم کی دھرتی
وطن چاند سلطانہ بی بی کی عظمت
وطن شیر دل ٹیپو سلطاں کی جرأت

چلو عہد کرلیں یہ سب آج مل کر
سدا ایک ہو کہ جئیں گے مریں گے

وطن ہے عزیز و ہمالہ کی عظمت
وطن یار و گنگ و جمن کی ہے عفت
وطن اپنا صبحِ بنارس نرالی
وطن دوستو شامِ دلکش اودھ کی
وطن اپنا تاجِ خلوص و محبت
وطن اپنا ہے ایک شہکارِ قدرت

چلو عہد کرلیں یہ سب آج مل کر
سدا ایک ہو کر جئیں گے مریں گے

وطن سرفروش بہادر بھگت کی
وطن باپو جی کے لہو کی نشانی
وطن نہرو جی کا سیاسی تدبّر
وطن ہے مقامِ سکونِ بہادر ؎
وطن راجیو گاندھی کا قلبی تعلّق
وطن اندرا جی کے دل کا تصدّق

؎ : لال بہادر شاستری

چلو عہد کر لیں یہ سب آج مل کر
سدا ایک ہو کر جئیں گے مریں گے

وطن آندھرا ہی نہیں ہے یہ سمجھو
وطن صرف بنگال ہی ہے نہ سوچو

وطن صرف پنجاب ہے نا اڑیسہ
وطن ناگالینڈ اک نہیں ہے ہمارا

وطن اپنا میگھالیہ ہی نہیں ہے
وطن صرف کرناٹکا ہی نہیں ہے

وطن صرف سکم کو ہرگز نہ جانو
وطن صرف آسام کو تم نہ جانو

وطن اک تری پورہ ہے یہ غلط ہے
وطن صرف ہریانہ ہے یہ غلط ہے

وطن سارے صوبوں کا پیارا وطن ہے
وطن ایکتا کا نیارا وطن ہے

چلو عہد کرلیں یہ سب آج مل کر
سدا ایک ہو کر جئیں گے مریں گے

وطن اک علاقہ نہیں ڈوگری کا
وطن کب رہا ہے مرہٹوں کا اپنا

وطن صرف مدراسیوں کا نہیں ہے
وطن گوجری داں کا ورثہ نہیں ہے

وطن صرف اردو نہ ہندی زباں کا
نہیں ہے وطن اک بہاری زباں کا

وطن ایک مجموعہ ہے ہر زباں کا
کہاں اس کو اہلِ وطن نے ہے سمجھا

چلو عہد کرلیں یہ سب آج مل کر
سدا ایک ہو کر جئیں گے مریں گے

دار و رسن

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

مرزا غالب

غزلیں

نظر سے کہانی سنائے چلا جا
چراغِ محبّت جلائے چلا جا

مصیبت بھی اک روز راحت بنے گی
مصیبت میں تو مسکرائے چلا جا

جہاں ہر طرف بجلیاں ٹوٹتی ہیں
وہاں تو نشیمن بنائے چلا جا

پہنچ جائے گا اپنی منزل پہ اک دن
نگاہیں کسی سے ملائے چلا جا

زمانہ نہ یہ شاغلؔ نہ تیرا بنے گا
زمانے کو اپنا بنائے چلا جا

○

عزمِ منزل رسی کی بات کریں
دوستو زندگی کی بات کریں

عظمتِ آدمی کی بات کریں
شانِ اسکندری کی بات کریں

دین و دنیا کی، کفر و ایماں کی
آج آؤ سبھی کی بات کریں

رنج و غم تو ھیں روز کے عنواں
آج حظّ و خوشی کی بات کریں

آج گیسوئے وقت سلجھائیں
پھر کبھی عاشقی کی بات کریں

قرئیہ جسمِ جنگ بن جائیں
امن کی، آشتی کی بات کریں

ہیں جہاں طاری ظلمتیں شاغلؔ
ہم وہیں روشنی کی بات کریں

○

○

ہر حلقۂ زنجیر کو پگھلائے ہوئے ہیں
کیا دار پہ کم گیت ترے گائے ہوئے ہیں

یا انجمنِ ناز کے ٹھکرائے ہوئے ہیں
یا شوق کا انجام یہی پائے ہوئے ہیں

یا رات کی تاریکیاں رک رک سی گئی ہیں
یا آج وہ پھر زلف بدوش آئے ہوئے ہیں

معیارِ سخن پوچھتے کیا ہو مرے اشعار
ہر لب پہ ہر اک دل میں جگہ پائے ہوئے ہیں

اے عزم جواں! مژدہ' نوید اے دمِ محکم
سنتے ہیں کہ منزل کے قریب آئے ہوئے ہیں

شاغلؔ ترے اشعار میں کیوں سوز نہ ہوگا
انگارے ہیں الفاظ جو دہکائے ہوئے ہیں

○

نقوشِ ماضی تصوّر میں جب ابھرتے ہیں
دل و نظر میں مرے آپ رقص کرتے ہیں

کہا یہ کس نے تمہارے ستم سے ڈرتے ہیں
مگر یہ سچ ہے کبھی سرد آہیں بھرتے ہیں

شراب کہتے ہیں غم سارے دور کرتی ہے
مگر یہ کیا ہے کہ پیتے میں غم نکھرتے ہیں

جوابِ پند و نصیحت یہی ہے اے واعظ
حیات پھل ہے گنہ کا گناہ کرتے ہیں

خمار و کیف، فضا بھول جاتی ہے ہمدم
جب ان کے گیسوئے عنبر فشاں بکھرتے ہیں

تجھے فرازِ سخن گوئی مل گیا شاغل
کہ تیرے شعر دلِ یار میں اترتے ہیں

اشک پینے، درد سہنے اور غم کھانے کا نام
زندگانی ہے فقط غم ناک افسانے کا نام

سینہ زخموں سے مہک اٹھا، کنول غم کے کھلے
دوست! تیری یاد بھی ہے اک بہار آنے کا نام

دوستی بس یوں ہی ملنے کا نہیں اے کم نگاہ
دوستی ہے اصل میں دل، دل مل جانے کا نام

محوِ بزم زلف و قد، کچھ خبر بھی ہے تجھے
عاشقی ہے دار پر بے خوف چڑھ جانے کا نام

دیکھ کر شاغلؔ ادیب اب تجھ کو دنیا سے الگ
ذہن میں ابھرا کوئی بدمست دیوانے کا نام

○

عکسِ رنج و ملال ہیں ہم لوگ
زندگی کا مآل ہیں ہم لوگ

گاہ سادہ فسانہ ہیں ہمدم
گاہ رنگیں خیال ہیں ہم لوگ

سازِ ماضی، ربابِ فردا کبھی
اور کبھی چنگِ حال ہیں ہم لوگ

جس کا اب تک جواب بن نہ پڑا
ایک ایسا سوال ہیں ہم لوگ

دکھ جھپٹتے ہیں ہم پہ یوں جیسے
اک غنیمت کا مال ہیں ہم لوگ

پیتے ہیں زہرِ اشک ، جیتے ہیں
عزم و دم کا کمال ہیں ہم لوگ

دہر کو جو عطا کرے مستی
ہاں! وہی مست حال ہیں ہم لوگ

تار و تیرہ ہو بزم اپنی کیوں
شمعِ روشن خیال ہیں ہم لوگ

ہے متاعِ حیات، غم تیرا
صاحبِ جاہ و مال ہیں ہم لوگ

ہم سے چمکے گی بزمِ فن ہر شب
ماہتابِ کمال ہیں ہم لوگ

یہ تعلّی نہیں ، ہے سچ شاغل
شاعری کا کمال ہیں ہم لوگ

وہ رسم و راہِ تیرگی اب بھی گئی نہیں
چہرے بدل گئے ہیں، کوئی اجنبی نہیں

دردِ جہانِ عشق، غمِ تلخیٔ حیات
تیرے نثار اب کسی غم کی کمی نہیں

اے جانِ بزم! تجھ کو خبر ہے ترے بغیر
ہر شمع جل رہی ہے مگر روشنی نہیں

اس شاعری سے ہم کو یہی تجربہ ہوا
اک ہم ہیں سب کے اور ہمارا کوئی نہیں

ہر لب پہ جگمگاتے ہیں سورج کے تذکرے
یہ اور بات ہے کہ کہیں روشنی نہیں

شاغلؔ! چلے ہیں جانبِ منزل تو سب مگر
اکثر یہی ہوا ہے کہ منزل ملی نہیں

○

شبِ فراق میں جب آسماں سنورتا ہے
کچھ اور رنگِ تمنّائے دل نکھرتا ہے

کچھ اور زخم لگاتی ہے گردشِ دوراں
تمہارے پیار کا جب کوئی زخم بھرتا ہے

مجھے نہیں ہے کوئی شک تری وفا پہ مگر
نہ جانے پھر بھی کیوں دل میں گماں گزرتا ہے

ترا خیال ہے یا ہے ہجومِ نور کوئی
ہر ایک لمحہ شبِ ہجر کا نکھرتا ہے

کچھ اور کھلتے ہیں ان کی نوازشوں کے گلاب
کچھ اور رنگِ غمِ زندگی نکھرتا ہے

مری نگاہ سے دیکھو کہ عہدِ حاضر میں
ہر ایک نقش نئے دور کا اُبھرتا ہے

یہ بات جس نے کہی ٹھیک ہی کہی تشنہ غلؔ
"خلوصِ فکر سے رنگِ غزل نکھرتا ہے"

راہزن راہوں میں اپنے جال پھیلاتے رہے
ہم مگر اپنی ہی دھن میں جھومتے گاتے رہے

دور جتنی دور تک تھیں رات کی تاریکیاں
دور اتنی دور ہم راہوں کو چمکاتے رہے

منحصر ہے اپنے اپنے عزم پر منزل رسی
قافلے یوں تو بہت آتے رہے جاتے رہے

ہر تسلی دشمنِ آرامِ جاں بنتی گئی
آپ کے خط اور دل کے زخم گہراتے رہے

جانے کس کے نقشِ پا تھے آنے والے قافلے
ہر قدم پر خونِ دل کے پھول برساتے رہے

بڑھ گئے کچھ اور شاغل جانبِ زنداں جو ہم
تقویت کچھ اور دل کے حوصلے پاتے رہے

○

تری نگاہ ملی، اک غمِ زمانہ ملا
ترے نثار! تری انجمن میں کیا نہ ملا

وہ بد نصیب جو تیرے ستم سے بچ نکلے
انہیں کہیں بھی زمانے میں آسرا نہ ملا

ہمیں نہ بھول سکی دار پر بھی یادِ دوست
انہیں حرم کی فضاؤں میں بھی خدا نہ ملا

کریں کیا ان کی جفاؤں کا اب گلہ کہ ہمیں
مزاجِ دہر بھی کچھ غیر دوستانہ ملا

ہزار دیر و حرم راستے میں آئے مگر
سوائے میکدے کے ہم کو راستہ نہ ملا

سنائی جب بھی غزل ہم نے اک نئی شاغلؔ
زمانہ سمجھا اسے اک نیا ترانہ ملا

○

○

ہم سحر کے دیوانے' جس طرف کو چلتے ہیں
ہر قدم مہ و انجم' پاؤں پر مچلتے ہیں

اک ترے بدلنے سے' ہم بدل نہیں سکتے
ہم اگر بدلتے ہیں' روز و شب بدلتے ہیں

جس میں ہو نہ کچھ احساس' اس کو دل کہیں کیسے
دل وہی ہے دامن میں' جس کے درد پلتے ہیں

نشۂ جنوں اپنا' خود ہی اک سہارا ہے
گرتے ہیں بظاہر ہم' اصل میں سنبھلتے ہیں

آتی ہے خوشی بھی اب' اک ہجوم غم لے کر
ہنستے ہیں تو آنکھوں میں' اشک بھی مچلتے ہیں

انقلاب دوراں کا' بس یہی خلاصہ ہے
جو فلک پہ اڑتے تھے' اب زمیں پہ چلتے ہیں

خود غرض زمانے کی' دوستی ارے توبہ
آدمی ہی کیا شاغلؔ' دل بھی اب بدلتے ہیں

○

○

اداس اداس ہے ماحول، خوشگوار کریں
غمِ حبیب ادھر آ کہ تجھکو پیار کریں

چلی ہے بات چمن میں بہار کی، ہم بھی
چلو کہ جیب و گریباں کو تار تار کریں

کسی نے آج نگاہیں چرائی ہیں ہم سے
کسی کا صحنِ چمن میں پھر انتظار کریں

کچھ اور تیرگیٔ ظلم بڑھ چلی ہے، چلو
کچھ اور مشعلِ دل ہم بھی شعلہ بار کریں

ترے ہی ذکر سے رونق ہے محفلِ دل میں
ترے بغیر بھلا خاک روزگار کریں

کبھی کبھی ہی چلیں سوئے میکدہ شاغلؔ
کبھی کبھی ہی سہی، یادِ چشمِ یار کریں

○

○

فضائے صحنِ چمن آج لالہ فام کریں
چلو چلو کہ بہاروں کا اہتمام کریں

ہجومِ زاہداں کیسا، یہ کیسی بزمِ مے
چلو کہ ہم بھی کسی رند کو امام کریں

ہیں ہم دِوانے، مگر ملتی ہے وہیں منزل
جہاں جہاں پہ رکیں اور جہاں قیام کریں

جنوں سے کچھ تری رسوائیاں نہیں مقصود
جنوں سے ہم نے یہ سوچا ہے تیرا نام کریں

اس انجمن سے نکل کر یہ سوچ ہے شاغل
گزاریں صبح کہاں، اور کہاں پہ شام کریں

○

○

وقارِ دردو غم زندگی نہیں معلوم
نہیں ہے آدمی کیوں آدمی نہیں معلوم

سلوکِ دوست کا شکوہ نہیں، مگر کب تک
ہمیں ڈبوئے گی یہ سادگی نہیں معلوم

تمام عمر رہے حادثہ شکار مگر
رہی کیوں یاد تری چوٹ ہی نہیں معلوم

غضب کہ پیار کی راہوں میں آج چل نکلے
وہ جن کو نام وفا بھی ابھی نہیں معلوم

چمن کھلا تو چمکے ہم جراحتِ دل کا
کلی کھلے گی کب اک آس کی نہیں معلوم

سکونِ دل نہ قرارِ حیات ہے ہم کو
ہو ختم کب یہ نوازش تری نہیں معلوم

ہمارے پیار کو شاغل نہ مل سکے گا پیار
ہمیں کہے گا بھی اپنا کوئی نہیں معلوم

○

○

چراغِ درد جلاؤ کہ روشنی کم ہے
جنوں کی بزم سجاؤ کہ روشنی کم ہے

نہ چھیڑو ذکر تعفّن بھرے زمانے کا
گلابِ زخم کھلاؤ کہ روشنی کم ہے

نہ جانے چھپ گئی منزل کہاں اندھیروں میں
مرے قریب تر آؤ کہ روشنی کم ہے

تمہارے شہر کی شاید ہے صبحِ شب پرور
یہ کیا ہے ورنہ بتاؤ کہ روشنی کم ہے

نہ بزمِ فکر ہے روشن نہ جامِ دل لبریز
غموں کا زہر پلاؤ کہ روشنی کم ہے

صدا یہ دیتا ہے شاغلِ رہِ وفا سے کون
لہو جگر کا جلاؤ کہ روشنی کم ہے

○

○

فریبِ ننگِ جنوں، نامِ دار جھوٹا ہے
یہ کیسا دور ہے ہر دوست یار جھوٹا ہے

ہے لب پہ نقدِ محبت نظر میں سودِ ہوس
ہوس کے تاجرو! یہ کاروبار جھوٹا ہے

کہی تھی کل جو کسی نے، وہ بات ہے گھر گھر
یقیں فریب ہے اک، رازدار جھوٹا ہے

یہ کیا کہ بو رہے ہیں پھول، آنکھ میں کانٹے
یا آج آپ ہی کا انتظار جھوٹا ہے

وقارِ چاکِ گریباں کی خیر ہو یارو
خزاں کا دور ہے، جشنِ بہار جھوٹا ہے

غمِ خلوص کی رفعت کے سامنے شاغلؔ
ہر ایک اوجِ غمِ روزگار جھوٹا ہے

○

ان کھلی کلیوں سے خوشبو کہو کیا آئے گی
جب یہ کھل جائیں گی، اک عمر گذر جائے گی

شب نہ ٹپکائے ستارے نہ سہی، صبح کی گود
میرے اشکوں کے ستاروں سے تو بھر جائے گی

دیکھو نظروں سے مری، تم کو یہی ظلمت نظرو
نور کا شہر ہر اک رات نظر آئے گی

آج جلتی ہے جلے دھوپ میں دنیا کی حیات
گیت آنچل میں کسی پیار کے، کل گائے گی

اپنی اک ایک وفا یار وہے عنوانِ خلوص
دشمنی آپ کی سرخی کہو کیا پائے گی

سمت رو راہنما زخم لگائیں جتنے
اتنی ہی تیز روی اپنی بڑھی جائے گی

پھاڑیں وہ لاکھ گلا، چیخیں وہ صدہا شاغل
بات وہ اپنے ترنّم کی کہاں آئے گی

مشعلِ درد کو بھڑکاؤ کہ کچھ رات کٹے
آج ہر زخم کو چمکاؤ کہ کچھ رات کٹے

پھر چلے ان کی حدیثِ لب و رخسار، چلو
دار پر ہم کو چڑھاؤ کہ کچھ رات کٹے

وہ تو سب بھر گئے اب تک جو ملے تھے یارو
اب کوئی زخم نیا کھاؤ کہ کچھ رات کٹے

تلخیٔ زیست کے سناٹے سے ڈر لگتا ہے
پھر غمِ یار کو بلواؤ کہ کچھ رات کٹے

اک نہ اک حادثہ ہر سانس کے ساتھ آتا ہے
میری جاں تم بھی چلی آؤ کہ کچھ رات کٹے

سرد و خاموش ہے اب انجمنِ فن شاغلؔ
شعر و احساس کو سلگاؤ کہ کچھ رات کٹے

○

اہلِ شہرت کو فقط نام سے دلچسپی ہے
اور ہم ہیں کہ ہمیں کام سے دلچسپی ہے

ان سے نسبت نہ ہمیں ربط ہے ان سے کوئی
یوں ہی پہچان سی ہے، نام سے دلچسپی ہے

موم کی طرح سے ہیں جلنے کے عادی ہم لوگ
صبح کا ذکر ہی کیا، شام سے دلچسپی ہے

فن کی خاموش ریاضت ہی ہے انعام ہمیں
ہم کو کب آپ کے انعام سے دلچسپی ہے

ساتھ چھوڑا ہے جس انجام کے ڈر سے تو نے
دوست! ہم کو اُسی انجام سے دلچسپی ہے

شخص وہ کون ہے جس نے یہ کہا تھا شاغل
"ہم کو اِس شاعرِ خوش کام سے دلچسپی ہے"

○

روشنی کو مانگے کی، روشنی نہیں کہتے
یارو! چاند کو سورج ہم کبھی نہیں کہتے

رنگِ شعر کھلتا ہے خونِ دل کے ملنے سے
صرف شعر کہنے کو، شاعری نہیں کہتے

دوستی گلستاں ہے اک شریف جذبے کا
دل میں کانٹے بونے کو دوستی نہیں کہتے

رہبری وہی ہے جو منزلوں کو چمکائے
بانٹنے کو تاریکی رہبری نہیں کہتے

پیار کا تعلق بھی اک سراب ہے ورنہ
عمر بھر کے ساتھی کو اجنبی نہیں کہتے

نام ہے وفا شاغل مستقل مزاجی کا
وقت کے غلاموں کو آدمی نہیں کہتے

○

اب احترامِ دردِ وغمِ دل نہیں رہا
یا آدمی ہی پیار کے قابل نہیں رہا

آدابِ بزم کا یہ نیا روپ دیکھنا
اک پل بھی میری سمت وہ مائل نہیں رہا

ہر فرد پھر رہا ہے لئے بے حسی کی لاش
جینے کا جیسے اب کوئی حاصل نہیں رہا

مرتے ہیں جیسے جی رہیں ہر دم یہی ہے سوچ
قاتل بھی آج کس لئے قاتل نہیں رہا

کیا تم سے دادِ فن ملے شاعر گروہ کہ اب
مومن پرست غالبِ محفل نہیں رہا

غم پیار کا ہے چہرۂ دل کا حسین تل
چہرے پہ دل کے آج وہی تل نہیں رہا

شاغلؔ ادیب! دشمنیٔ دوستاں کی خیر
سینے میں ایک زخم ہے اب دل نہیں رہا

○

راہِ وفا میں یوں تو کئی ہم سفر ملے
لیکن یہ کیا ہوا کہ ہمیں دار پر ملے

اب چشم سے لہو مری ٹپکے ہے رات دن
خواہش تھی کتنی ہم کو بھی دردِ جگر ملے

بانٹا کئے ہیں سب کے غم و درد ہم سدا
ہر اک سے پیار ہم کو بھی یارو مگر ملے

جس موڑ پر حیات کے بچھڑے تھے مجھ سے تم
پھر موڑ پر اُسی مجھے کیوں عمر بھر ملے

ہم شام ہی سے شب کو لگا لیتے ہیں گلے
ہے آس بس یہی کہ کسی دن سحر ملے

شاغلؔ ادیب! فن بھی ہے اب مصلحت پسند
ممکن نہیں کہ سب کو خراجِ ہنر ملے

○

حالات کے ہاتھوں میں جو پتھر نہیں ہوتا
زخمی کبھی اس طرح مرا سر نہیں ہوتا

چلنا ہے ضروری کہاں ہر شخص کے پیچھے
سنسار کا ہر فرد پیمبر نہیں ہوتا

آگے مرے ہر ہاتھ میں آتا ہے نظر پھول
پیچھے مرے کس ہاتھ میں خنجر نہیں ہوتا

تھا مجھکو ڈھکیلا کسی اپنے نے کنویں میں
دور اب بھی نگاہوں سے وہ منظر نہیں ہوتا

مدت ہوئی گھر چھوڑے ہوئے مجھ کو مگر آج
کیا جانئے کیوں دل سے جدا گھر نہیں ہوتا

ہے دوش پہ ہر شخص کے افلاس ہی کی لاش
ہر شخص مقدر کا سکندر نہیں ہوتا

کل شب وہ مرے حال پہ دل کھول کے رو دیئے
یہ حادثہ معلوم ہے اکثر نہیں ہوتا

آنکھوں میں ہمیشہ ہی نمی رہتی ہے شاغل
دُور اشکوں کا ہم سے یہ سمندر نہیں ہوتا

سونے کی طرح میں بھی ہر دور میں تپا ہوں
مجھ کو زمانہ دیکھے، کھوٹا نہیں کھرا ہوں

کیا سوچ میری اپنی، ہے قید تیرے غم میں
یا اپنی ہی وفا کے جنگل میں، میں پھنسا ہوں

تم بے ضمیر ہو کر برسوں سے پھر رہے ہو
میں آج بھی وفا کی دہلیز پر کھڑا ہوں

یارو! تمہیں مبارک اس شہر کی خدائی
ہے کیا مرا کہ میں تو اک بندۂ خدا ہوں

وہ جو تھا گل کا طالب، بھاگے ہے دور مجھ سے
جیسے ببول کا میں اک پیڑ ہو گیا ہوں

کھو کر انا تم اپنی، ہو دور ہر نظر سے
میں کھو کے اپنا سب کچھ، ہر دل میں جا چکا ہوں

کیا ساتھ لے چلو گے، شاغل ادیب ہم کو
میں ساتھ اپنے ساری دنیا کو لے چلا ہوں

○

ہم نے نہ تم کو جانا، قاتل ہو کہ مسیحا
دنیا سے پوچھ لینا، تم ہو حقیقتاً کیا

اس کو چھپا نہ پایا، یہ رات کا اندھیرا
دن کی طرح ہے چمکے، ہر گھاؤ میرے دل کا

ہے کون سی یہ بستی، انساں کا ذکر ہی کیا
سایہ بھی اب لگے ہے، ہم کو یہاں پرایا

حسرت سے رات دن میں جس در کو دیکھتا ہوں
دستک میں خود بھی اس پر برسوں سے دے نہ پایا

ہر فردِ شہر کی اب، خطرے میں زندگی ہے
سولی پہ وقت کی ہے، ہر فرد آج لٹکا

ممکن نہیں کسی سے اس کا علاج یارو
یہ درد وہ ہے جس کا، کوئی نہیں مسیحا

شاغلؔ ادیب! ہم نے چھوڑا ہے پیچھے شب کو
اپنے سفر کی منزل، تہذیب کا سویرا

○

ہر گام پر ہے ریت کی دیوار دیکھنا
منزل ہے اُن سرابوں کے اُس پار دیکھنا

ہے راج نفرتوں کا، محبت کے شہر پر
ہر سمت ناگ دیوں کی پھنکار دیکھنا

مٹی کے برتنوں کی سجائے ہو تم دکاں
پتھر حسد سے مارے نہ سنسار دیکھنا

گزرا ہے اس طرف سے ہلاکو صفت کوئی
روتے بلکتے چیختے بازار دیکھنا

جلنے نہ پائے کوئی مکاں اہلِ شہر کا
نفرت کے پھیلے شہر میں اشرار دیکھنا

ہیں بند جن میں تجربے روشن دماغ کے
گھر میرے ان کتابوں کے انبار دیکھنا

عصری ادب کا آئینہ یہ بھی ہیں یا نہیں
شاغل ادیب! یہ مرے اشعار دیکھنا

اپنے لہو کے رشتوں نے دھوکہ دیا سدا
بیٹی مری ہوئی نہ ہی بیٹا مرا ہوا

منزل ہے کون سی، بھلا جادہ ہے کون سا
ہر راہرو لگے یہاں جلتی ہوئی چِتا

سنسار کیا ہے سپنا، یہ دنیا ہے حشر اک
سپنا ہے ایک جھوٹ، یہ جینا عذاب سا

کس شئے کو اپنی کہہ کے کروں اس پہ ناز میں
ہے میرا کیا سبھی تو ہے اُس کا دیا ہوا

پیتے پہ تو یہ کہتا ہے "پینا حرام ہے"
توبہ پہ میری کیوں ہے یہ چہرہ ترا بجھا

نیکی پہ بغض اور بدی پر تھا قہقہہ
افسوس! یہ ہمارے رقیبوں کا حال تھا

شاغلؔ ادیب! مجھ سے سبھی مل کے رو پڑے
پیکر ہوں ان دنوں میں کئی حادثات کا

○

سپنوں کا نگر ہے کہ یہ شمشان ہے بابا
ہر گام پہ جلتا ہوا انسان ہے بابا

لاحول پڑھیں کس پہ دعائیں دیں کسے ہم
اس دور کا انسان بھی شیطان ہے بابا

آرام کڑی دھوپ میں ہے مجھکو مگر وہ
بادل کی گھنی چھاؤں میں حیران ہے بابا

جب بات وہ کرتا ہے تو لگتا ہے فلاطون
یوں دیکھنے میں وہ بڑا نادان ہے بابا

جس رشتے کی تقدیس پہ قربان ہے سنسار
اُس رشتے سے افسوس وہ انجان ہے بابا

شاغلؔ کا ادب میں بھی بڑا نام ہوا ہے
شاغلؔ پہ بہت آپ کا احسان ہے بابا

○

○

جب سے ملی ہے چشمِ غمِ روزگار سے
ہر درد کو قریب کیا ہم نے پیار سے

کلیاں فسردہ ، پھول بجھے ، آشیاں جلا
گلشن کو کیا ملا ہے بھلا اس بہار سے

کل رات ہم کو نیند نہ آئی بجا مگر
کل شب رہے ہیں وہ بھی بہت بیقرار سے

نقّاد سے ادب رہے محفوظ اس طرح
محفوظ پھول ہوتے ہیں جس طرح خار سے

ترتیب دیتی ہے ہمیں تاریخ پیار کی
ہم کو نہیں ہے کام ، دلوں کے غبار سے

شاغلؔ ! مری نگاہ میں رقصاں ہیں دونوں رُت
" نفرت خزاں سے ہے محبّت بہار سے "

○

پہلے ہی سے اس گھاؤ پہ ہے یاس کا پتھر
تو رکھ نہ مرے زخم پہ احساس کا... پتھر

ہوں آج پڑا راہ میں بے مول ہوں، سچ ہے
کل میں بھی ہوں گا کسی اتہاس کا پتھر

اس قبر کے ماتھے پہ سجا ہے کوئی کتبہ
یا وہ ہے مرے سپنے کے بن باس کا پتھر

ممکن نہیں ہے مسخ نہ ہو زیست کا چہرہ
ہر شخص لیے ہاتھ میں یاس کا... پتھر

یوں تو دلِ انساں پہ ہیں پتھر کئی شاغل
لیکن نہیں ہے بیت کی بو باس کا پتھر

○

وقت وہ زیست کا سہارا ہے
تیری صحبت میں جو گزارا ہے

کم ہے جتنا بھی اس پہ خوش ہوں ہم
حاصلِ عشق غم تمہارا ہے

تم کو شاید پتہ نہیں لیکن
ہم نے اکثر تمہیں پکارا ہے

جھوم اٹھوں گا میں پی کے اے ساقی
مجھ کو کافی ترا اشارہ ہے

چھو سکے آج تک نہ ہم تجھکو
تو بھی گویا فلک کا تارا ہے

شاعری اصل میں ہے کوہکنی
پھر بھی ہم کو یہ "لفظ" پیارا ہے

جتنا فنکار کو دبایا گیا
فن نے اتنا اسے ابھارا ہے

دشمنوں کی نہ پوچھو اے شاغل
ہم کو خود دوستوں نے مارا ہے

○

○

چھوڑا تھا آپ نے ہمیں جس موڑ پر جناب
ہم پر کھلی وہیں سے ہر اک رہگزر جناب

چہرے سے خود ہی جھلکے گا اندر کا آدمی
پہلے ملائیے گا نظر سے نظر جناب

پی پی کے اشک ایک سمندر بنا ہے دل
کیا ٹھہرے اس کے آگے کوئی چشمِ تر جناب

شاید میں اس کے خواب میں آیا تو جاگ اٹھا
ورنہ ابھی تو دور بہت ہے سحر جناب

کچھ اور ہم پہ نقد و نظر کی نظر پڑے
کچھ اور رنگ لائیں یہ اپنے ہنر جناب

شاغلؔ کا نام اچھال کے کیا پائیے گا کوئی
شاغلؔ ہے نیک نام، بڑا نامور جناب

○

○

بیکار میرے دوست روایات کو نہ چاٹ
دنیا بدل گئی ہے چل اب تو بھی اور باٹ

روتا ہے تھامے ہاتھ کوئی نامراد جاٹ
فصلوں کو شب بھی شب میں کوئی لے گیا ہے کاٹ

سورج کو اپنے سر پہ لئے گھومتے ہیں ہم
اب ظلمتوں کی کھائی کو ہم لوگ دیں گے پاٹ

احباب جب کہ ہو گئے ماضی پرست سب
چلئے گا ہم بھی آج پہن لیں پرانا ٹاٹ

بہتی ندی پہ آس کی پیاسوں کا ہے ہجوم
خشکی میں اس سے دور ہیں خود اسکے اپنے پاٹ

شعری سفر میں کیا ہوا شاغل نہ پوچھئے
صنعت گری کی دھن میں غزل ہو گئی سپاٹ

○

ہر سمت مجھ کو پانی کا سایا دکھائی دے
عالم تمام کہرا ہی کہرا دکھائی دے

اپنائیت کی کاوش یہ معراج پاؤں میں
ہر اجنبی میں اپنا ہی چہرہ دکھائی دے

آنکھوں کے آگے دکھ کا سمندر تو ہے سدا
یارب ! کبھی تو سکھ کا جزیرہ دکھائی دے

دل تشنہ، ہونٹ خشک امیدیں ہیں ریت ریت
یہ زیست ہم کو دوستو صحرا دکھائی دے

شاغل ادیب وقت کا شکوہ فضول ہے
جب سایہ اپنا آج پرایا دکھائی دے

○

کون کس کے درد میں ہوتا ہے شامل آج کل
ہیں سبھی کے سامنے صدہا مسائل آج کل

صد نثار اُس موڑ کے، جس موڑ پر ہم آ گئے
اب ہمارے سامنے ہے راہِ منزل۔ آج کل

دشمنوں کا ذکر بے جا، وقت کا شکوہ فضول
آدمی ہے آپ اپنا خود ہی قاتل آج کل

زندگی میں ہر رہِ پُر پیچ سے گزرے ہیں ہم
کوئی بھی مشکل نہیں ہے ہم کو مشکل آج کل

شاعری تو ہو رہی ہے خوب، پھر کیا بات ہے
محفلوں میں کم نظر آتے ہیں شاغل آج کل

○

○

جسم خالی ہے، جان ہے خالی
زندگی کا مکان ہے خالی

تارے امید کے نہیں کوئی
آس کا آسمان ہے خالی

پیاس ناکام لوٹ آئی ہے
مے کی اک اک دکان ہے خالی

دل پڑا رو رہا ہے کھائی میں
عشرتوں کی چٹان ہے خالی

بولتا میں بھی ہوں، کہا کس نے
میری اپنی زبان ہے خالی

کون دے گا دلاسا اے شاغل
پیار تنہا، جہان ہے خالی

○

○

بجھ گیا ہے دلوں کا ہر احساس
ہو گئی ختم زیست کی بو باس

بستیوں میں نہیں گزر اس کا
جنگلوں میں بھٹک رہی ہے آس

دل شکستہ، دماغ ناکارہ
ہے مآلِ وفا یہی اب پاس

وقت سب پر ہی مہرباں ہوا
وقت آیا نہ بس ہمیں کو راس

رام آئے نہ اب نظر کوئی
اب کیا جائے گا کیسے بن باس

پی گئے یوں تو ہم سمندر بھی
شاغل اپنی بجھی نہ لیکن پیاس

○

○

برگد کی گھنی چھاؤں نہ زلفوں کی گھٹا ہے
ہر شخص کڑی دھوپ کے صحرا میں کھڑا ہے

ساکت سا کسی کونے میں افسوس پڑا ہے
شاید کہ وہ میری ہی طرح ٹوٹ چکا ہے

محتاط بہت رہنا ہے عیسیٰ نفسوں سے
ہر گام یہاں جال صلیبوں کا بچھا ہے

دو شخصوں کے بیچ آج یہ دیوار ہے کیسی
اُس پار کھڑا کوئی یہی سوچ رہا ہے

اس شہر میں سب اپنی پرستش کے ہیں خواہاں
اس شہرِ انا کا تو ہر اک ذرّہ خدا ہے

جینے کی دعاؤں کا مزا پا تو چکے ہیں
درکار فقط اب ہمیں مرنے کی دعا ہے

یہ صحبتِ جامی[۱] نے سکھایا مجھے شاغل
"ہے وہ ہی سخنور بڑا انساں جو بڑا ہے"

○

۱ حضرت خورشید احمد جامی مرحوم

○

اندھیری کھائی سے باہر مجھے نکال گیا
وہ ایک لمحہ مری زندگی اچھال گیا

سدا معمہ ہی جھولی میں کوئی ڈال گیا
درِ وجود پہ جب بھی مرا سوال گیا

گہر نا چاہا تھا خود کو ملی نہ خالی سیپ
وہ نامراد سمندر سبھی کھنگال گیا

وہ ایک شخص جو تھا میری راہ کی دیوار
وہ ایک شخص مجھے بارہا سنبھال گیا

یہ سچ ہے اپنی انا سے نہ بچ سکے لیکن
رفیقو! زہر تمہارا بھی پائمال گیا

تمام رات رہی سر پہ دھوپ ہی شاغلؔ
مرے وجود پہ سورج یہ کون اچھال گیا

○

○

میں ریگ زارِ وقت میں بھٹکا کیا بہت
ذروں کے ساتھ بکھرتا رہا بہت

پاگل اُسے کہیے کہ اوتار کرشن کا
کیوں اپنے سائے کو وہ پکڑتا رہا بہت

ہوں آگ یا ہوں پانی، ہوا ہوں یا خاک ہوں
مجھ کو مرے وجود نے الجھا دیا بہت

گو مر گیا تھا اپنے جنم ہی پہ میں مگر
بیکار اجل نے مرا پیچھا کیا بہت

کیا پوچھتے ہو یاروں کے اس شہر کا سلوک
شاغلؔ سا موم دل بھی یہاں پتھرا گیا بہت

○

حیات مثلِ گہر ہے، اچھال کر دیکھو
سمندروں کو غموں کے کھنگال کر دیکھو

کرم سے اس کے بھرے گا جواب کا کشکول
مگر ہے شرط ذرا تم سوال کر دیکھو

کھُلے گا تم پہ کہ جیتے جی مرنا ہے کیا شئے
مرا جو حال ہے وہ اپنا حال کر دیکھو

خلوص اور بھی نیّت کا جگمگائے گا
تمام نیکیاں دریا میں ڈال کر دیکھو

ملیں گے لوٹ کے مجھ سے اجالے، دیکھو گے
مجھے گپھاؤں سے باہر نکال کر دیکھو

ہے شیشے سا بڑا نازک ہمارا دل شاغلؔ
کہیں یہ ٹوٹ نہ جائے، اچھال کر دیکھو

○

کرب و احساس کے ساغر کو جگایا جائے
سانحہ مجھ کو نیا کوئی پلایا... جائے

جھانکو مجھ میں کہ ہوں جذبات کا بہتا لاوا
مجھ کو پتھر کی طرح یوں نہ بُتایا جائے

شہر کا شہر ہے بہروپ بھرے راہ بہ راہ
میرے چہرے پہ بھی اک چہرہ لگایا جائے

سب کے آنگن سے گزارے گا اجالا سورج
پہلے تفریق کی دیوار کو ڈھایا جائے

وقت کے ساتھ تو بہتے رہے صدیوں تشاغل
کیوں نہ اب وقت کو ساتھ اپنے بہایا جائے

○

ہم ٹھہری ہوئی جھیل میں پھینکا کیے پتھر
یا گنتے رہے بس یوں ہی حالات کے چکر

ہر شخص ہے اس دور میں راون کی طرح تو
ہے کون جو کہلائے محبّت کا پیمبر

شیشہ گھروں کی یارو حفاظت ہے ضروری
دیوانہ زمانہ ہے لئے ہاتھ میں پتھر

اکثر مرے دل میں رہیں زخموں کی بہاریں
سینے میں مرے پھول کھِلے ان ہی سے اکثر

شاغل جی وہاں پر بھی چلے آئیں گے احباب
تم لاکھ رہو دور کہیں بستی سے جاکر

○

جن کے چہرے سے سکوں یار و عیاں ہوتا ہے
ان کے سینے میں مگر درد نہاں ہوتا ہے

صبح کھا جاتی ہے اور شام نگلتی ہے انہیں
وقت کے ماروں کو سکھ چین کہاں ہوتا ہے

ہم کہ پی جاتے ہیں امڈے ہوئے آنسو اپنے
دردِ دل ہم سے کہاں کھُل کے بیاں ہوتا ہے

کوئی ہم درد غریبوں کا نہیں دنیا میں
بے کسوں کا تو خدا ہی نگراں ہوتا ہے

یہ حقیقت ہے عبارت ہے وفا ہم سے مگر
بے وفائی کا انہیں پھر بھی گماں ہوتا ہے

دل کے جلنے سے نہ کیوں لب پہ کراہیں آئیں
شمع جلتی ہے تو محفل میں دھواں ہوتا ہے

بے قصور آج بھی سولی پہ ہیں لٹکے شاغل
"آج کے دور میں انصاف کہاں ہوتا ہے"

○

○

جمالِ حسن و رخِ فن رہا ہے آنکھوں میں
سدا یہ وقت کا درپن رہا ہے آنکھوں میں

مثالِ شمع جلا گام گام دل اپنا
ہر ایک راستہ روشن رہا ہے آنکھوں میں

سدا جلاتے رہے درد کے الاؤ ہمیں (مجھے)
مرا وجود کہ کندن رہا ہے آنکھوں میں

نہ کب سروں پہ اڑے کرب کے گھنے بادل
نہ کب بلاؤں کا ساون رہا ہے آنکھوں میں

میں بھول جاؤں بھی دشمن کو کیسے اے شاغل
ہمیشہ وہ مرا دشمن رہا ہے آنکھوں میں

○

○

غم وفا کی راہ کا، اس دل میں کیا رکھتا ہوں میں
ہر غمِ دنیا کی منزل کا پتہ رکھتا ہوں میں

اشک کے انجم، غموں کے چاند، زخموں کے چراغ
ان سے اپنا آج گھر آنگن سجا رکھتا ہوں میں

شب چڑھے روتا ہوں تاریکی میں شبنم سا مگر
دن نکلتے پھول سا چہرہ کھلا رکھتا ہوں میں

بے خبر اے گردشِ دوراں تجھے کچھ آج بھی
دل میں روشن تیرے داغوں کا دیا رکھتا ہوں میں

ہوں عجب دیوانہ میں بھی دوستی کے شہر کا
دشمنوں کے واسطے نقدِ وفا رکھتا ہوں میں

میں کہ ہر اک دور کے مقتل میں مارا ہی گیا
لوگ کہتے ہیں "مجھے غم کیا خدا رکھتا ہوں میں"

ہے یقیں شاغل مجھے پاؤں گا میں دادِ ہنر
ہر کسی کے آگے فن کا آئینہ رکھتا ہوں میں

○

○

دعا مانگی ہے اپنا ہم نوا سنسار ہو جائے
بہت ممکن ہے سارا شہر اپنا یار ہو جائے

دعا کرنا کہ میں سارے جہاں کے کام آجاؤں
دعا کرنا مسیحا سب کا یہ بیمار ہو جائے

نچھاور ہو گی انساں تجھ پہ رفعت سارے عالم کی
اگر اونچا تری گفتار کا معیار ہو جائے

جنوں میرا نہ مجھ تک ہی رہے محدود اے یارو
جنوں میرا یہ دشمن کے گلے کا ہار ہو جائے

خلوصِ ذات ہے اس میں نہ شامل جذبۂ خدمت
تو کیسے کامراں پھر آج کا فنکار ہو جائے

○

اشکوں کا ہلاہل

اے کاش تجھے ڈھنگ سے جینا آتا
ہر زخم کو ہنستے ہوئے سینا آتا
مل جاتا ہر اک گھونٹ پہ امرت کا مزہ
اشکوں کا ہلاہل تجھے پینا آتا

شاغل ادیب

○

سینے میں اک ہلکی سی چبھن باقی ہے
اک آس کی دھندلی سی کرن باقی ہے
اے دوست ترے اپنے تغافل پہ بھی
وہ سوزِ محبت وہ لگن باقی ہے

—

ہر درد ہے اب دل کا ابھرنے والا
ہر زخم ہے سینے کا نکھرنے والا
ہر سمت دیئے غم کے جلائیں آؤ
انساں کا مقدر ہے سنورنے والا

—

ہر درد میں اک لطف نیا پاتا ہوں
ہر غم پہ غزل ایک نئی گاتا ہوں
اے درد و غمِ یار تصدق تیرے
دنیا کے ہر اک غم سے گذر جاتا ہوں

○

رباعیات

○

دنیا نے ہمیں یا رو ستایا ہے بہت
سینے پہ سدا زخم لگایا ہے بہت
ہے اپنی ہستی سے اِسے اک نفرتِ خاص
کم بخت نے ہر لمحہ رلایا ہے بہت

—

ہر درد پہ اوروں کے مچل جاتا ہوں
ہر غم کے دلاسے پہ بہل جاتا ہوں
بھڑکاتا ہے اپنوں کا سدا مجھکو سلوک
یہ میری شرافت ہے سنبھل جاتا ہوں

—

اے رفعتِ تہذیب تجھے دیکھ لیا
اے اوجِ تمدّن تجھے ہم نے پرکھا
ہے یہ بھی اک اندازِ ترقّی شاید
انساں ہی کی نظروں سے ہے انسان گرا

○

قومی یکجہتی

پھولوں کی طرح رہنا ہے سب کو کھل کے
ٹوٹیں نہ کبھی دوستو رشتے دل کے
اس دیس کی "ایکائی" پہ آئے نہ کبھی آنچ
جینا ہے یہاں مِل کے ہے مرنا مِل کے

قرآن کا سبق سب کو پڑھانا ہے ہمیں
گیتا کے پاٹھ سب کو سنانا ہے ہمیں
دیتا ہے ہمیں آشتی کا سندیہ
ہر بھارتی کو "ایکتا" سکھانا ہے ہمیں

مسلم ہو کہ ہندو ہو کہ سکھ عیسائی
سب کی ہے اسی بات میں اب اچھائی
لے ڈوبے گی یہ فرقہ پرستی سب کو
قائم کرو مل جل کے یہاں "ایکائی"

ہر ذرّہ ہمالہ نظر آتا ہے مجھے
ہر قطرہ بھی گنگا نظر آتا ہے مجھے
قربان ترے دیدۂ قدر و عظمت
پتھر بھی تو ہیرا نظر آتا ہے مجھے

نذرِ امجد

شہنشاہِ رباعی حضرت امجد حسین امجدؔ کی وفات پر

○

اب فلسفۂ زیست کا پیغام گیا
صہبائے تصوّف کا بھرا جام گیا
ہے شور بپا ہر سو دکن میں "ہے ہے"
اک سعدیؔ اردو گیا خیّام گیا

وہ حاصلِ رنگین بیانی نہ... رہا
فنکارِ ادب، غیرتِ مانی نہ رہا
اے وائے! گیا شاہِ رباعی امجدؔ
افسوس کہ ایسا سرمدِ ثانی نہ رہا

وہ شاعر و سرتاجِ سخن ہم میں نہیں
وہ شعلہ نوا، صاحبِ فن ہم میں نہیں
تھی دھوم بڑی شعر و ادب میں جس کی
اے وائے! وہ عندلیبِ دکن ہم میں نہیں

○

نیا سازؔ نیا نغمہ

چھیڑ سازِ نو، نیا نغمہ سنا
گا نئی دھن اور نئی تانیں اڑا
سینۂ بزمِ کہن میں بھر امنگ
اور دیارِ فن پہ اک جدّت کھلا

شاغل ادیب

قطعات

ہوں نیا انساں مری باتیں نئی
دن نئے میرے، مری راتیں نئی
ہر سحر میرے لئے پیغامِ نو
شام ہر، لاتی ہے سوغاتیں نئی

تیرہ ذہنی کو درخشاں کر تو لوں
روحِ افسردہ کو تاباں کر تو لوں
پھونک ڈالوں ظلمتِ خلوت ندیم
بجھتی ہستی میں چراغاں کر تو لوں

نغمۂ شوق گا رہا ہوں میں
غنچۂ دل کھلا رہا ہوں میں
بزم میں ہے بپا قیامت اک
آگ جل میں لگا رہا ہوں میں

یہ ترا حسنِ نازنیں محبوب
نرم و نازک کلی سے ملتا ہے
تو کہ مرمر کا اک صنم گویا
تجھ کو ہر لمحہ میں نے پوجا ہے

ہے قیامت ہر سحر میرے لئے
اور پیغامِ اجل ہر شام ہے
فرصتِ غم ایک لمحہ بھی.... نہیں
زندگانی کیا اسی کا نام ہے

صبح جیتے ہیں شام مرتے ہیں
یوں بسر زندگانی کرتے ہیں
کون سمجھے گا یہ کہ روز و شب
کیسے شاغل کے اب گزرتے ہیں

زندگی جیسے ایک صحرا ہے
درد کی دھوپ میں جلے ہے آس
ہے مقدر ہر آدمی کا.... یہی
ریت کھالینا اور پینا پیاس

چھاؤں کوئی، کوئی آنچل بھی نہیں
کوئی سایہ کوئی گیسو بھی نہیں
دھوپ میں بھٹکے کوئی کب تک بتا
زیست بن باس ہے اور تو بھی نہیں

قطعات اردو

تاریخی، تہذیبی، قومی اور لسانی نظریات کے زیر اثر

ہے یہ اردو زباں اگر اپنی
اپنی تہذیب کی ہے گر پونجی
آؤ اس کی بقا کا عہد کریں
ہے اگرچہ یہ ورثۂ قومی

بولی اردو نہیں ہے پردیسی
ہے جنم بھومی اس کی بھارت ہی
اصل اس کی اگر سمجھنی ہے
شاعری دیکھئے گا خسرو کی

نکتے سمجھائے اس نے قرآں کے
گائے گیتا کے پاٹھ بھی اس نے
آشتی کا پیام ہے اردو
اس نے جینا سکھایا "ایکے سے"

ہر طرف اس کی ہے رسیلی صدا
ہے کھڑی بولی کا یہ راگ نیا
نغمگی اس کی پوچھتے کیا ہو
میٹھے سُر والی ہے برج بھاشا

قطعاتِ عید

سینے میں سو چراغ جل اُٹھتے
آج گر تیری دید ہو جاتی
گیت ہونٹوں پہ سو مچل اُٹھتے
گر وطن میں یہ عید ہو جاتی

ہم کو جام سکوں پلا نہ سکی
دردِ و غم ہائے دل بھلا نہ سکی
اے کہ بچھڑی ہو مجھ سے تم جب سے
آج تک میری عید آ نہ سکی

ہونٹ جم جاتے ہیں، ہنسی کیا ہے
سانس رکتی ہے زندگی کیا ہے
اے مری غم نواز تو ہی بتا
عید کیا چیز ہے، خوشی کیا ہے

اے خلش! ٹھہر دم ذرا لوں میں
ہم نواؤں کی یاد آتی ہے
عید ہے خوش ہیں سب مگر جانے
چشم میری کیوں خوں بہاتی ہے

○